پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد
ادارۂ مسعودیہ
۶/۲، ۵-ای، ناظم آباد، کراچی (سندھ)
اسلامی جمہوریہ پاکستان - ۱۴۲۱ھ / ۲۰۰۰ء

موضوعِ خیال

ڈاکٹر محمد مسعود احمد

ادارۂ مسعودیہ، کراچی پاکستان

کتاب ——— موجِ خیال

مصنف ——— پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد

کاتب ——— مولانا شاہ محمد چشتی سیالوی، قصور

ناشر ——— ادارۂ مسعودیہ

طبع دوم ——— سنہ ۱۴۱۷ھ / سنہ ۱۹۹۶ء

صفحات ——— ۳۱۴

تعداد ——— ایک ہزار

قیمت ——— ۷۰/- روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ مسعودیہ :- ۵ — ۶/۲ ای ناظم آباد - کراچی

مظہری پبلیکیشنز :- A/۲۶۰۶ پی - آئی - بی کالونی کراچی فون ۲۹۸۵۳۱

المختار پبلیکیشنز :- ۲۵ جاپان مینشن رضا چوک (ریگل) صدر کراچی

مکتبہ رضویہ ——— آرام باغ روڈ، کراچی

مکتبہ غوثیہ :- سبزی منڈی کراچی فون نمبر ۴۹۴۳۳۶۸

ادارۂ مسعودیہ ——— بسمینٹ ۱۱ انشتر روڈ لاہور

مکتبہ قادریہ :- جامعہ نظامیہ رضویہ اندرونِ لوہاری گیٹ - لاہور

اسی کے نام

جس نے آدمِ خاکی کو خلافت و حکومت بخشی ——— جس نے آئینِ محمدی کو عظمت و شوکت بخشی ——— جس نے اہلِ حق کو ہمت و نصرت بخشی ——— جس نے فکر و خیال کو رفعت و وسعت بخشی ——— جس نے جان و دل کو محبت و مودّت بخشی ——— جس نے شمس و قمر کو حدّت و برودت بخشی ——— جس نے لالہ و گل کو نزہت و نکہت بخشی سے

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں!

——— احقر محمد مسعود احمد عفی عنہ

گفتنی و ناگفتنی

کاروانِ حیات رواں دواں تھا ـــــ زندگی نے ایک نئی کروٹ لی ـــــ آنکھیں کھل گئیں ـــــ معلوم ہوا ایک نئے جہان میں آ گئے ـــــ دماغ کھل گیا ـــــ دل کے سوتے اُبل پڑے ـــــ خیالات تڑپنے لگے ـــــ افکار چلنے لگے ـــــ مضامین اترنے لگے ـــــ اور قلم ـــــ خود بخود چلنے لگا ـــــ جو کچھ لکھا ـــــ کھا نہیں ـــــ کھوایا گیا ؎

میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں

بے نیاز نہ گزر جائیے تو دیکھتے ہوئے بھی کچھ نظر نہیں آتا ـــــ نیاز مندانہ قدم رکھئے تو بغیر دیکھے بھی بہت کچھ نظر آنے لگتا ہے ؎

مجبورِ یک نظر آ، مختارِ صد نظر جا!

ورڈسورتھ نے جھوٹ نہیں کہا تھا ـــــ صحرا میں ایک ننھا سا پھول بھی دیکھتا ہوں تو وہ جلوے نظر آتے ہیں کہ بیساختہ آنکھوں سے آنسو بہ نکلتے ہیں" ـــــ

تو جو کچھ لکھا گیا ـــــ خود بخود لکھا گیا ـــــ یہ کوئی تحقیقی مقالہ نہیں کہ پڑھ پڑھ کے دل اچاٹ ہو جائیں ـــــ نہ ناول و افسانہ نہیں کہ لگی چھٹ نہ سکے ـــــ انقلابی تحریر نہیں کہ جذبات کو ہوا دے کر بیٹھے بٹھائے شورش پسند بنا دے ـــــ ہاں اتنا بے کیف بھی نہیں کہ نہ پڑھا جائے ـــــ اتنا بے فیض بھی نہیں کہ ٹھکرا دیا جائے ـــــ کوئی موضوع نہیں اور پھر بھی ہر موضوع ہے ؎

فانوس کے پردے میں کیا کیا نظر آتا ہے!

شاید دورِ جدید کی ہنگامہ خیز زندگی سے یہ طرزِ تحریر ہم آہنگ ہو ——— اب اتنی فرصت کہاں کہ ایک ہی موضوع پر گھنٹوں صرف کیجئے! ——— جو بات کہنی ہے، دو تین جملوں میں کھڑے کھڑے بتا دیجئے اور بس ——— اس تحریر کی اثر انگیزی کا اس وقت احساس ہوا جب ایک ادا شناس عزیز نے پڑھ کر بیساختہ کہا :-

"اس کا ایک صفحہ آپ کی ساری تحقیق پر بھاری ہے"

سبحان اللہ! ——— پندرہ سولہ برس جو علمی تحقیقات میں صرف کئے وہ بیکار گئے ——— اللہ اکبر! ——— جس کو کچھ نہ سمجھا وہی سب کچھ نکلا ——— اور جس کو سب کچھ سمجھا وہ کچھ نہ نکلا!

"موجِ خیال" کا یہ ذخیرہ "تاثرات" کے عنوان سے پہلے ماہنامہ "رشاد" (سیالکوٹ) میں نومبر ۱۹۷۲ء سے اکتوبر ۱۹۷۳ء تک شائع ہوتا رہا ——— رشاد کے بند ہو جانے کے بعد جنوری ۱۹۷۴ء سے ماہنامہ "ضیائے حرم" (لاہور) میں مسلسل شائع ہو رہا ہے ——— اب تک جو کچھ شائع ہوا وہ اس جلد میں آپ کے سامنے ہے ——— آئندہ جو کچھ شائع ہوگا وہ دوسرے ایڈیشن میں شامل کر لیا جائے گا (انشاء اللہ تعالیٰ) ——— یہ سلسلہ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک بہت پسند کیا گیا ——— اور اسی پسندیدگی نے طباعت و اشاعت کی طرف متوجہ کیا ——— اس کریم کا شکر ہے جس نے ہزار پابندیوں میں بھی فکر و خیال کو آزاد رکھا۔

میں سمجھتا ہوں اس دنیا میں جو آیا ہے اس کو خلوص کے ساتھ اپنے تجربات و مشاہدات اور محسوسات قلمبند کر دینے چاہئیں کہ آنے والوں کے کام آئیں اور جانے والے کی زندگی آنے والوں کے لئے کارآمد ہو ؎

ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو!

مگر اب جب اس حیرت کدے میں آ تا ہے اس کو کھنے کی کہاں فرصت! ــــــ پہلے دیکھ تو لے ــــــ اور اس دیکھنے دیکھنے ہی میں اس کا کام تمام ہو جاتا ہے ــــــ ہزاروں آئے اور چلے گئے ــــــ ہم بھی آئے ہیں اور چلے جائیں گے ــــــ کوئی رہا ہے جو ہم رہیں گے! ــ

مجھ سے مت جی کو لگا کہ نہیں رہنے کا
میں مسافر ہوں کوئی دن کو چلا جاؤں گا

دنیائے صحافت کا عجیب حال ہے ــــــ ایسے ایسے اخبارات و رسائل سامنے آ رہے ہیں ــــــ پڑھ پڑھ کر جن سے نظریں بہک رہی ہیں ــــــ خیال بھٹک رہے ہیں ــــــ نفس مچل رہے ہیں ــــــ دل مُجرِر ہے ہیں ــــــ اللہ اللہ آج کچھ اور آج کل کے کلیموں کا طور ہے

اس ہنگامۂ ہاؤ ہُو میں دل کی بات کون سنتا ہے! ــــــ لیکن کوئی سنے یا نہ سنے، یہ بات ہی کچھ ایسی ہے کہ کہی جاتی ہے تو بالآخر سنی جاتی ہے ــــــ انشاء اللہ سنی جائے گی ــــــ مایوس نہیں ــــــ جس کا یہ عقیدہ ہو کہ سارا عالم ایک بار مر کر جی اٹھے گا وہ اس بات سے کیسے ناامید ہو سکتا ہے کہ خوابیدہ قوم کبھی بیدار نہ ہو گی ــــــ

ہاں اے جوانو! ــــــ اے ماضی کے شگوفو! ــــــ اے حال کی بہارو! ــــــ اے مستقبل کے طوفانو! ــــــ سنو سنو ــــــ دل کی بات سنو!

۸

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

احقر محمد مسعود احمد

حیرت کدۂ مٹھی
(ضلع تھرپارکر، سندھ، پاکستان)
۲۵ اپریل ۱۹۷۷ء

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

البقرہ: ۲۳۱

اور اس نعمت کو یاد کرو جس سے اللہ نے تمہیں سرفراز فرمایا

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

آل عمران: ۱۰۳

(ہاں) اور اس نعمت کو یاد کرو جس سے اللہ نے تمہیں سرفراز فرمایا

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

المائدہ: ۷

(ہاں ہاں) اور اس نعمت کو یاد کرو جس سے اللہ نے تمہیں سرفراز فرمایا

آپ حضرت مولانا مفتی محمد مظہر اللہ قدس سرہ کے صاحبزادے ہیں کہ جو جامع کمالاتِ ظاہری و باطنی تھے، ان کے تقویٰ اور پاک نفسی کے دوسرے مذاہب کے لوگ بھی معترف تھے، یہ انھیں کی تربیت اور فیضِ نظر کا اثر تھا کہ ایسے اہلِ علم اور اہلِ قلم پیدا ہوئے کہ جنھوں نے ان کی یاد تازہ کر دی اور ان کے نام کو روشن رکھا ؎

کمالِ فضلِ پسر زیب و زینتِ پدر است
شود ز آبِ گہر نہم ابرِ نیساں سبز

(کراچی، ۹ جون ۱۹۷۵ء)

(حضرت مولانا محمد ہاشم جان مجددی قدس سرہ المتوفّٰی ۱۹۷۵ء از)

اولادِ امجاد حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی قدس سرہ العزیز

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب، دہلی کے مشہور و ممتاز عالم دین اور روحانی پیشوا حضرت مفتی اعظم ہند الحاج شاہ محمد مظہر اللہ قدس سرہ العزیز (شاہی امام مسجد جامع فتحپوری، دہلی) کے فرزند رشید ہیں جن کی حق گوئی اور بیباکی نے باطل کا سر ہمیشہ نیچے رکھا ——— پروفیسر موصوف گزشتہ پندرہ سال میں ۷۰ سے زیادہ تحقیقی مقالات و مضامین لکھ چکے ہیں اور ایک درجن سے زیادہ کتابیں تصنیف فرما چکے ہیں اور یہ تمام علمی ذخیرہ شائع ہو چکا ہے ——— ان کی تحقیقات ہر مکتب فکر کے علماء میں بنظرِ استحسان دیکھی گئیں، پاک و ہند میں بھی اور بیرونی ممالک میں بھی ——— یہ بات فاضل مؤلف کی اعتدال پسندی کی دلیل اور ہمہ گیر مقبولیت پر شاہد ہے ؎

یہ کیفیت اسے ملتی ہے ہو جس کے مقدر میں
مئے الفت نہ خم میں ہے، نہ شیشے میں، نہ ساغر میں

(میرپور خاص، سندھ، ۱۹ مئی ۱۹۷۴ء)

(حضرت پیر محمد اسحاق جان مجددی سرہندی قدس سرہ العزیز، المتوفی ۱۹۷۵ء
از اولادِ امجاد حضرت شیخ احمد سرہندی مجددِ الفِ ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز)

۳

آپ کی تحریر میں میانہ روی اور دلنشینی ہے، آپ ہر بات سمجھ کر اور پرکھ کر مع دلائل لکھنے کے عادی ہیں، شاید یہ مخصوص ورثہ ہے جو سراپائے قدس و مکرمت حضرت امام صاحب یعنی اپنے والد سے آپ کو ملا ہے، آپ نے اس چھوٹی سی عمر میں کام بڑے بڑے انجام دے ڈالے، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ اور عمر میں برکت عطا فرمائے اور توفیقِ خیر زیادہ سے زیادہ ارزانی فرمائے، آمین!

(کراچی، جولائی ۱۹۷۱ء)

(حضرت مولانا مخدوم سید حامد الجلالی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ المتوفی ۱۹۷۳ء، از اولادِ امجاد حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت قدس سرہ العزیز)

وہ ملک کے ممتاز ترین محققین میں سے ایک ہیں، ان کی کئی تصانیف اور بلند پایہ تحقیقی مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ (ترجمہ انگریزی)

(حیدر آباد، فروری ۱۹۷۱ء)

انہوں نے ملک میں نام پیدا کر لیا ہے۔ وہ ان محققین میں سے ایک ہیں جن پر فضلاء اعتماد کر سکتے ہیں اور کوئی بھی یونیورسٹی فخر کر سکتی ہے۔

(ترجمہ انگریزی) (حیدر آباد، ۹ ستمبر ۱۹۷۲ء)

(پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، صدر شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، حیدر آباد سندھ)

ڈاکٹر محمد مسعود احمد کا انداز بیان نہایت دل آویز اور ان کی زبان بڑی شگفتہ ہے۔ آج کا قاری اس سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

(کراچی، ۱۷ ستمبر ۱۹۷۳ء)

(ڈاکٹر محمود حسین مرحوم، وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی)

۹

وہ ایک روشن دماغ اور حساس قلب کے مالک ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ فطرۃً محقق ہیں اور ہر وقت میدانِ علم و تحقیق میں شدائد و مصائب جھیلنے کے لئے تیار رہتے ہیں، جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس پر کمال قدرت رکھتے ہیں اور اس فن سے واقف ہیں کہ موضوع کو بہتر سے بہتر طور پر کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے ——— بحیثیت مصنف وہ ایک قابلِ ذکر قدر و منزلت اور شہرت پہلے ہی حاصل کر چکے ہیں۔ (ترجمۂ انگریزی)

(کراچی، ۱۳ مئی ۱۹۷۴ء)

(سید انور علی، ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان کراچی)

۱۰

مولانا مسعود صاحب تو قلم کار کی حیثیت سے بھی ہند و پاک میں نمایاں مقام کے مالک ہیں اور ان کی کئی نگارشات منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔

(ماہنامہ منادی، نئی دہلی، دسمبر ۱۹۶۶ء)

جناب مسعود احمد ملک کی جانی پہچانی ایک علمی اور ادبی شخصیت ہیں۔

(روزنامہ نوائے ملت، مردان، ۱۶ر فروری ۱۹۷۴ء)

آپ ایک کہنہ مشق ادیب اور بیباک محقق ہیں، محققانہ انداز بیان آپکا طرۂ امتیاز ہے جس سے آپ علماء میں ممتاز نظر آتے ہیں۔

(پندرہ روزہ الحسن، پشاور، ۱۵ر دسمبر ۱۹۷۴ء)

جنابِ محترم مولانا محمد مسعود احمد صاحب انتہائی فاضل عالم ہیں، آپ متعدد بیش بہا تصانیف اور ان گنت تحقیقی مقالے سپردِ قلم کر چکے ہیں، مولیٰ تعالیٰ نے آپ کو دانش و بینش کے ساتھ ساتھ جذبِ دل اور گدازِ روح بھی بڑی وافر مقدار میں عطا فرمایا ہے۔

(ماہنامہ رشاد، سیالکوٹ، اگست و ستمبر ۱۹۷۳ء)

۱۴

جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب (ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی) کا اندازِ نگارش جس میں حسن و جمال، پاکی و درخشانی، پھر دریائے تحقیق میں آبِ حقیقت افروز کی طرح بناک روانی اور انداز و اسلوب میں سلیم الفطرۃ طبعِ مومنانہ کی عاشقانہ جولانی ایک ایک سطر میں اور پھر آسمانِ صحافت کے درخشندہ و رخشندہ تابناک ستاروں کی ضوفشانی ایک ایک حرف میں جھلمل جھلمل کرتی نظر آتی ہے۔

(ہفت روزہ نظریۂ پاکستان، لائلپور، ۲۷ ستمبر ۱۹۷۱ء)

۱۵

پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب کا یہ سلسلۂ مضمون اس لحاظ سے بہت ہی قیمتی ہے کہ اس میں کتابِ زندگی کے اہم ابواب کی جھلکیاں نہایت قابلیت سے پیش کی جا رہی ہیں۔

(ماہنامہ ضیائے حرم، لاہور، اپریل ۱۹۷۴ء)

۱۶

چھوٹے چھوٹے جملوں میں وہ جس طرح بڑی بڑی باتیں لکھ دیتے ہیں یہ انہی کا حصہ ہے سمندر کو کوزے میں بند کرنا کوئی ڈاکٹر صاحب موصوف سے سیکھے۔

(ماہنامہ ضیائے حرم، لاہور، اکتوبر ۱۹۷۴ء)

۱۷

بظاہر چھوٹے چھوٹے مضمون یا یوں کہئے کہ مضمونچے لیکن جو جہانِ معنی ان میں پوشیدہ ہے وہ اہلِ نظر پر ظاہر ہے۔

(ماہنامہ ضیائے حرم، لاہور، دسمبر ۱۹۷۵ء)

۱۸

آپ کے قلم سے نکلی ہوئی چند کتابیں نظر سے گزریں جنہیں اعتدال و پختگی اور شگفتگی و روانی قلم کا اعلیٰ ترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے ـــــ کتنا حقیقت نگار ہے آپ کا قلم اور کتنا پختہ ہے آپ کا اندازِ تحریر! ـــــ واللہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور قلب کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلتی ہے ؎

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

(۲۸ جولائی ۱۹۷۶ء)

(علامہ محمد یٰسین اختر الازہری، استاذ ادب عربی، الجامعۃ الاشرفیہ، مبارکپور، اعظم گڑھ، بھارت)

۱۹

آپ کی تحریریں چشمِ بد دور، اس قدر مبنی بر عشق ہیں کہ واقعی کوثر کی دھلی ہوئی زبان معلوم ہوتی ہے۔

(مارچ ۱۹۷۶ء)

(پروفیسر ڈاکٹر نظیر حسین زیدی، الہدیٰ، کراچی)

۲۰

آپ کے پیدا کردہ جذبوں، ولولوں اور عزم و ارادے نے غلامانِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہ وسلم کو خوابِ غفلت سے بیدار اور احساسِ فرض کے لئے مجبور کر دیا ———— اور اب تو

محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

(۲۲ جولائی ۱۹۷۶ء)

(چوہدری حبیب احمد، پیپلز کالونی، لائل پور، پاکستان)

۲۱

ضیائے حرم میں جناب کے تاثرات سے صرف فقیر ہی نہیں بلکہ ضیائے حرم کا ہر قاری متاثر ہے، یہ چشمۂ فیض جاری رہے اور ہم جیسے تشنہ لب سیراب ہوتے رہیں آمین ثم آمین۔

(۷ ستمبر ۱۹۷۶ء)

(پیر محمد کرم شاہ ایم اے (الازہر) سجادہ نشین بھیرہ شریف ضلع سرگودھا، پاکستان)

میں نہ کوئی ادیب ہوں اور نہ علمی استعداد ہی کچھ ہے، آپ کے اس مضمون کی سلاست اور جامعیت دیکھ کر میں اس کشمکش میں ہوں کہ نہ تو یہ رنگ ڈپٹی نذیر احمد کا ہے، نہ ہی سرسید کا، فرحت اللہ بیگ اور خواجہ حسن نظامی کا رنگ بھی جداگانہ ہے، غالب کا رنگ بھی ادبارا انفرادی ملتے ہیں، لیکن آپ کی یہ طرزِ تحریر ان سب سے جدا رہتے ہوئے باکمال اور جامع نظر آرہی ہے۔ میں کہوں گا کہ آپ کا رنگ ان سب سے جدا ہے لیکن اس میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو کسی اچھے مضمون نگار میں ہونی چاہئیں تنقید میں آل احمد سرور اور پروفیسر احتشام حسین، نیز کلیم الدین کے ہاں وہ مزا نہیں جو آپ کے ہاں مجھے اس مختصر مضمون میں میسر آیا ——— اعتدال پسند مزاج اور عادلانہ تصنیف و تالیف کا جو تصور ذہن میں آتا ہے وہ اس سے پہلے کسی اور تصنیف میں اتنا نظر نہیں آیا۔

(۱۹ر دسمبر ۱۹۷۴ء)

(مفتی محمد مکرم احمد ایم۔اے، نبیرہ مفتی اعظم ہند، مسجد جامع فتحپوری، دہلی)

۲۳

یہ زور دکمال اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہزاروں میں سے ایک کو انعام ہوتا ہے کہ جسے دورِ قدیم والے بھی چاہیں اور دورِ جدید والے بھی سراہیں اور استفادہ میں دونوں برابر رہیں اللّٰھم زد فزد! ایسٹرونومی والے اسے JANUS کا مقام دیتے ہیں کہ یہ ستارہ دروازہ کی طرح اپنے دونوں رخ روشن رکھتا ہے اور ہزاروں لاکھوں میں ایک ہی ہوتا ہے ورنہ دوسرے عام و خاص ستاروں کی روشنی دیوار کے مانند ہے کہ صرف ایک رخ روشن ہے' دوسرا تاریک' یا تو دورِ قدیم والے اپنائیں اور دورِ جدید والے کترائیں یا اس کے برعکس۔

(۱۴ر جنوری ۱۹۷۳ء)

(فاضلِ جلیل قاضی محمد حمایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پرنسپل دانشکدہ، کراچی)

۲۴

اب تک جسے شناور سمجھتے تھے وہ تو غوطہ خور بھی نکلا، جس دم کا کرشمہ کر دیا کہ تہ سے صدفِ صادق ڈھونڈ نکالا، اس صدف سے وہ دُرِ یکتا نکلا جس کی آب و تاب نے نگاہیں چندھیا دیں، تحریر کیا ہے؟ بس آیاتِ محکمات کا مظہر ہے جو متشابہات کے معانی منصورہ بتا رہی ہیں، جانِ مشتاق رقص کرنے لگی اور صوتِ سرمدی سے احسنت احسنت کی صدائیں آنے لگیں، یہ سب افصح العرب والعجم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلق لگاؤ اور دین الحق کی طرف جھکاؤ کا ثمرہ جاں فزا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاخِ بارور سے پھول دار بیل جا بجا پھیلی اور خوشبوئے روح پرور نے تختہ کا تختہ مہکا دیا، اس تحریر میں ذکر کا سوز بھی ہے اور شغل کا ساز بھی، فکر کی پرواز بھی ہے اور دل کی آواز بھی، علمِ مفید کی روشنی بھی ہے اور عملِ صالح کی چاشنی بھی، الفت کا جوش بھی ہے اور محبت کا خروش بھی، صداقت کا شوق بھی ہے اور حقانیت کا ذوق بھی، کسب سے بڑھ کر موہبت کارفرما ہے۔

(۲۹ رذی قعدہ ۱۳۹۲ھ)

(محققِ پاکستانی عزیز الملک علامہ محمد یوسف سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ م ۱۹۷۶ء کراچی)

(ریکارڈ کیپر سنٹرل ریکارڈ آفس لائبریری ریاست جے پور)

موج در موج

موج در موج

فکر و خیال، ۳۹
زبانِ دل، ۴۰
قلبِ سلیم، ۴۰
امن و امان، ۴۰
فتنہ انگیزی، ۴۱
جاں بانی، ۴۲
نکتہ چینی، ۴۳
نامراد و بامراد، ۴۴
خلافت و فراست، ۴۴
اختیار و اقتدار، ۴۶
معدلت گستری، ۴۸
احتساب و اکتساب، ۵۰
معلم و متعلم، ۵۲
تہذیب و تمدن، ۵۴
زبان و بیاں، ۵۶
ایمان و اسلام، ۵۷
ثبات و کردار، ۵۸
آزادی یا گرفتاری، ۶۲

نگاہِ تیز ، ۶۴

بے نیازی و نیازمندی ، ۶۵

رسول و دشمنِ رسول ، ۶۶

نصیحت و عبرت ، ۶۷

یک رنگی و دو رنگی ، ۶۸

تکاثر و تفاخر ، ۷۲

آمد و آورد ، ۷۴

سخن فہمی و سخن سنجی ، ۷۶

مسند نشینی یا بت پرستی ، ۷۹

زمانہ ، ۸۰

رحمت و غفلت ، ۸۲

شادی و غم ، ۸۵

احساس ، ۸۸

روباہی و شیری ، ۸۹

آزادی یا خود گرفتاری ، ۹۱

اشتراکیہ یا بم ، ۹۴

اقرار و انکار ، ۹۷

ایمان و لیکن ، ۹۹

غم اور ضبطِ غم ، ۱۰۱

نقطۂ نظر کی بات ، ۱۰۲

تاجداری و خاکساری ، ۱۱۲
یادِ رفتگاں ، ۱۱۳
مزارات و مقابر ، ۱۱۴
ساز و آواز ، ۱۱۸
سکوت و خاموشی ، ۱۲۰
سائنس و آرٹس ، ۱۲۲
حجاب و بے حجابی ، ۱۲۴
منزل بمنزل ، ۱۲۶
باری باری ، ۱۲۸
سادگی و بے نیازی ، ۱۳۰
طاقت و صداقت ، ۱۳۱
اپنے لئے یا غیر کے لئے ؟ ، ۱۳۳
تہمت بے تابی ، ۱۳۴
احتساب ، ۱۳۷
استاد و شاگرد ، ۱۴۱
حساب و کتاب ، ۱۴۴
قانونِ الٰہی ، ۱۴۵
زمین و آسمان ، ۱۴۶
غیبتیں اور چغلیاں ، ۱۴۷

نصیحت و اجرت ، ۱۴۹

مریض و حکیم ، ۱۵۱

بت گری و بت تراشی ، ۱۵۲

عظمتِ مستعار ، ۱۵۵

مزاجِ عالم ، ۱۵۶

غیرتِ کفر ، ۱۵۶

عید یا وعید ، ۱۵۷

آلام ، ۱۵۹

تمنات و خطابات ، ۱۶۰

مبلغِ علم ، ۱۶۳

اپنی مدد آپ ، ۱۶۴

صد رحمی ، ۱۶۶

دل و دماغ ، ۱۶۸

یادِ رفتگاں ، ۱۶۹

شکر رنجیاں اور تلخیاں ، ۱۷۰

موت کا سناٹا ، ۱۷۳

خواب و خیال ، ۱۷۴

پریشاں خیالی ، ۱۷۶

آغوشِ مادر ، ۱۷۸

آئینہ ، ۱۸۰

قومی لباس ، ۱۸۲

افکار و اخبار ، ۱۸۴

فکر و صاحبِ فکر ، ۱۸۵
جرم و سزا ، ۱۸۷
بس و بے بس ، ۱۸۸
زمین و آسماں ، ۱۸۹
مرد و زن ، ۱۹۲
منازل و مراحل ، ۱۹۶
دل و دماغ ، ۱۹۶
اعجازِ فاروقی ، ۱۹۷
اہل اللہ و اہلِ دنیا ، ۲۰۲
کامیابی و ناکامی ، ۲۰۲
مقتول و معزول ، ۲۰۳
کاغذی مہرے ، ۲۰۵
خادم و مخدوم ، ۲۰۷
باشعور و بے شعور ، ۲۰۹
درجہ بدرجہ ، ۲۱۰
آگے اور پیچھے ، ۲۱۱
سازِ خیال ، ۲۱۲
تقلید و اجتہاد ، ۲۱۲
فرضِ شریعت و فرضِ محبت ، ۲۱۴
معقولیت ، ۲۱۶
حادثات و تجربات ، ۲۱۷
اتار چڑھا ، ۲۱۸
اس کے لئے یا اپنے لئے ؟ ، ۲۲۰

خالی ہاتھ ، ۲۲۲
پندارِ علم ، ۲۲۳
رنگ برنگ ، ۲۲۵
ظاہر و باطن ، ۲۲۶
خاک باد و پائندہ باد، ۲۲۷
مقصد و بے مقصد، ۲۲۸
استاد و فنکار ، ۲۳۱
العوام کالانعام ، ۲۳۳
صورت و سیرت ، ۲۳۳
خوف و احترام ، ۲۳۴
تعریف و تنقیص ، ۲۳۴
اہتمامِ لفظ ، ۲۳۵
وجہت پسندی یا معقولیت پسندی؟ ، ۲۳۶
دل! ، ۲۳۷
یہ زندے! ، ۲۳۸
رفیقۂ حیات ، ۲۳۹
فریادی ، ۲۴۰
انقلابِ خاموشی ، ۲۴۱
اعجازِ قلم ، ۲۴۲۰
ضد ہٹ دھرمی ، ۲۴۳

۳۳

انسانِ کامل ، ۲۴۴
محبت یا نفرت ، ۲۴۷
تضحیکِ محبت ، ۲۴۸
یادیں اور باتیں ، ۲۴۹
حصار ، ۲۵۰
جنت کی حقیقت ، ۲۵۲
عورت اور مرد ، ۲۵۴
نظامِ مصطفٰے ، ۲۵۸
عاشقِ رسول ، ۲۶۲

موجِ گہر

دیکھے تُو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے
ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے
شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے

فکر و خیال

فکر و خیال عشرہ ایسا ہو کہ آن میں دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جاتی ہے ——— آبادیاں ویران ہو جاتی ہیں ——— ویرانے آباد ہو جاتے ہیں ——— پاکستان اسی فکرِ فلک رسا کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے ——— کہتے ہیں کہ عطیۂ الٰہی ہے ——— اس میں کیا شک ہے ——— مگر فکر کس کا عطیہ ہے؟ اسی کا تو ہے ——— اور اسی فکر کی کج روی عذابِ الٰہی بن کر نمودار ہوئی۔

دائرۂ فکر جتنا وسیع ہوتا ہے، ترقی کی راہیں کھلتی ہیں اور ترقی کی راہیں کب کھلتی ہیں فردِ ملت کا وقار بلند ہوتا ہے ——— اوجِ ثریا تک پہنچتا ہے ——— اسلام نے انسانی فکر کا دائرہ جتنا وسیع کیا ہے شاید ہی کسی نے کیا ہو ——— نوعِ انسان پر یہ خدا کا عظیم احسان ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ انسان فطرۃً احسان فراموش واقع ہوا ہے۔

قدم قدم پر انسان بھٹکتا گیا، قدم قدم پر رہنمائی ہوتی رہی ——— قربان جائیے اس رحیم و کریم کے! ——— ایک فرد نے دوسرے فرد کو نیچا دکھایا، ایک خاندان نے دوسرے خاندان پر فوقیت جتائی ——— ایک زبان والے نے دوسرے زبان والے کو ہیچ جانا ——— ایک رنگ والے نے دوسرے رنگ والے سے نفرت کی ——— لیکن قربان جائیے اس پیکرِ قدسی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جس نے کسی کو حقارت سے نہ دیکھا ——— جس نے سب کی عزت افزائی کی ——— جس نے سب کو اپنا جانا اور ببانگِ دہل اعلان فرمایا کہ "آج سے نہ عربی کو عجمی پر فخر ہے، نہ گورے کو کالے پر، سب اللہ کے بندے ہیں، سب مٹی سے بنے ہیں، ہاں مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ اپنے خدا کی مرضی پر چلا اور حقِ بندگی ادا کیا"

——— یہ آواز کیا گونجی، فکرِ انسانی ——— جو سمٹی سمٹی سی تھی، پھیلنے لگی اور پھیلتے پھیلتے فضائے بسیط پر چھا گئی ———

زبان و دل

بہت سے دل زباں سے قریب ہیں اور کچھ دل زباں سے دُور ——— بہت دُور، یہ دُوری بڑی مہلک ہے ——— یہ لوگ مریض ہیں ——— ان کو شفقت کی ضرورت ہے ——— ان کو پیار کی ضرورت ہے ——— ان کو خلوص کی ضرورت ہے ——— شفقت نہ ملے گی، پیار نہ ملے گا، خلوص نہ ملے گا، دیوانے ہو جائیں گے ——— تباہ کر دیں گے، تباہ ہو جائیں گے ——— ہاں امراضِ روحانی کے معالجو! ذرا ہمت کرو اور ان بیماروں کی خبر لو۔

قلبِ مسلم

مومن کا قلب بڑا وسیع ہوتا ہے کائنات سے بھی زیادہ وسیع ؎

مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

——— وہ صفدرِ روزگار پر خلیفۃ اللہ ہے ——— کوئی معمولی بات نہیں ——— وہ مسجودِ ملائک ہے ——— کوئی کھلونا نہیں ——— وہ صفاتِ الٰہیہ کا آئینہ ہے، وہ جبار و قہار ہے، وہ رحیم و کریم ہے ——— وہ ظالموں کے لئے جبار و قہار ہے اور مظلوموں کے لئے رحیم و کریم ——— بلکہ اس کے دامن میں گنہ گار و سیہ کار، خطا کار و زیاں کار سب ہی پناہ لیتے ہیں ——— پس جس کی فطرتِ سلیمہ اس رحم و کرم کی آئینہ دار ہو ——— جس کے دامن میں چور بھی پناہ لیں وہی خلیفۂ برحق ہے ——— اہل اللہ کے حالات پڑھیں گے، یہ نمونے نظر آئیں گے ——— جابرانِ وقت کے ہاں یہ بات نہیں ——— سعادت مند وہ ہیں جو ان نمونوں سے روشنی حاصل کریں اور جوئے کم آب کو محیطِ بیکراں بنا لیں۔

امن و امان

امن و امان کی فضا، اخوت و محبت کی فضا صنعتوں سے قائم نہیں ہوتی ——— اس کی اہمیت تسلیم ——— مگر یہ فضا دماغ کی جلا اور دل کی صفائی سے قائم ہوتی ہے، اسی لئے قرآنِ کریم نے بعثتِ نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ و

اسلام) کے مقاصد یہ بتائے کہ قلب و ذہن کا تزکیہ اور تطہیر کی جائے، کتابِ مبین سکھائی جائے، حکمت و دانائی بتائی جائے ——— اگر مقصد کسی قسم کی مادی ترقی ہوتا ——— جس سے ہرگز ہرگز قلب و نظر کو سکون نہیں ملتا ——— تو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں چھوٹی موٹی صنعتیں قائم کی جاتیں ——— دورِ نبوی میں دنیا بغیر صنعت کے نہ تھی، اور اہلِ عرب کی معاشی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہ تھی، اس لئے کچھ نہ کچھ تو کیا جاتا ——— مگر اس سلسلے میں کچھ نہ کیا گیا، کوئی انڈسٹری قائم نہ کی گئی، صرف ایک انڈسٹری قائم کی اور وہ دل کی انڈسٹری تھی جس نے آگے چل کر خانقاہوں کی صورت اختیار کرلی، دلوں کو روشنی ملی، آنکھیں کھل گئیں ——— پیٹ کی آگ نہیں بھڑکائی گئی، شمعِ دل فروزاں کی گئی کہ شب کی تاریکیاں دور ہوجائیں، صبح کا اجالا نمودار ہوجائے۔

فتنہ انگیزی

فتنے یوں ہی پیدا نہیں ہوتے، آگ دشمنوں کے لگائے سے لگتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر شعوری طور پر اپنوں کے لگائے سے بھی لگ جاتی ہے ——— اس لئے ہر فتنے کو دشمن کے سر تھوپنا دانشمندی نہیں ——— دانشمندی یہ ہے کہ فتنوں کے اسباب و علل پر غور کیا جائے اور ان کا خلوصِ دل سے سدِ باب کیا جائے ——— محض تقریروں یا تحریروں سے فتنے نہیں دبا کرتے اس کے لئے بڑی پامردی، بڑی استقامت، بڑا خلوص، بڑی دلسوزی، بڑی دلداری کی ضرورت ہے ——— سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا؟ پہلے برائیوں کا سدِ باب کیا ——— کسی برائی کو سر اٹھانے نہ دیا، پوری طرح سرکوبی کی ——— میدان صاف ہوگیا ——— نیکیاں پھیلتی چلی گئیں ——— ہمارا حال عجیب ہے اور سمجھ سے بالاتر، پرہیز نہیں کرتے، علاج کی بات کرتے ہیں ——— مگر پرہیز شرطِ اول ہے ——— زندگی کی ہر منزل اور ہر شعبے میں پرہیز کی ضرورت ہے ——— بغیر پرہیز زندگی محال ہے ——— آزادیاں معقول پابندیوں میں پنپتی ہیں اور یہ پابندیاں پرہیز نہیں تو اور کیا ہے! ——— آؤ آؤ! حکیمانہ فکر کے ساتھ پرہیز شروع کریں

صحتِ ملی کو برباد نہ کریں۔

بہت سے ایسے ملیں گے کہ جب برائیوں کے اسباب وعلل کی نشاندہی کی جائے اور ان سے یہ کہا جائے کہ نیکیاں پھیلانے میں تو پہلے ان کا تدارک ضروری ہے ——— جواب ملے گا کہ اس میں کیا حرج ہے! ——— یہ بھی ہوتا رہے، وہ بھی ہوتا رہے ——— لیکن جب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہزار پابندیاں لگا کر اپنا مشن پورا کیا (اور دنیا کے کسی مصلح نے بغیر پابندیاں لگائے اصلاح کا کام نہیں کیا) تو پھر ہم بغیر پابندیاں لگائے اس مشن کو کیسے آگے بڑھا سکتے ہیں! ——— شیطان کو پابند کرنا ہوگا، رحمٰن کی بات جب ہی چل سکتی ہے ——— ہر فرد ذمہ دار ہے، ہر فرد کو محاسبے کی ضرورت ہے۔

جہانبانی

فقیر بھی گھر کر لیتا ہے، امیر بھی گھر کر لیتا ہے ——— بات گھر کرنے کی نہیں، گھر کو رشکِ جنت بنانے کی ہے ——— جہاں سکون ہی سکون ہو، جہاں قرار ہی قرار ہو ——— سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فقیرانہ بسر کی مگر گھر کو رشکِ جنت بنا دیا ——— جہاں امن و امان کے چشمے ابل رہے تھے ——— اور اس فقیری میں وہ رعب و دبدبہ کہ ہزار زرق و برق خلعتیں اور توپ و بندوق کی سلامیاں وہ بات پیدا نہ کر سکیں، جگر نے کیا خوب کہا ہے ؎

ظاہر میں غریب الغربا پھر بھی یہ عالم
شاہوں سے سوا سطوتِ سلطانِ مدینہ

اللہ اللہ اپنے غلاموں کو کیا اندازِ خسروی سکھایا ہے ——— ایسی فقیری پر جہانِ شاہی قربان ——— جس کو اس فقیری کی لذت مل گئی، پھر وہ کسی طرف نظر بھر کے کبھی نہیں دیکھتا۔

روس کو اپنے مثالی معاشرے پر بڑا گھمنڈ ہے مگر یہاں بھی وہ بات کہاں جو جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا کر دی تھی ——— بات سے بات نکلتی ہے ——— جس زمانے میں روس نے پہلے پہل فضائے بسیط میں اپنا سیارہ چھوڑ کر دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا نموت و

بامراد نامراد

جن کو اللہ نے اپنی بیکراں نعمتوں سے نوازا ہے ان کو چاہیئے کہ دوسروں کو بھی ان نعمتوں میں شریک کریں کہ اس سے محرموں کا دل بڑھتا ہے نہ محرومیاں اور نامرادیاں انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں ——— ان محروموں کو نامراد کہہ کر چڑانا، کفرانِ نعمت ہے ——— نہیں معلوم اس کی نظر میں کون محبوب ہے، کون مردود ——— ہمارے معیار اور ہیں ——— اس کا معیار اور ——— پس جس طرح منعمِ حقیقی نے تم کو نوازا ہے، تم بھی دوسروں کو نوازو ——— قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ "وہ شخص ایمان کی بلندی پر نہیں پہنچ سکتا جو عزیز ترین شے کو راہِ جاناں میں قربان نہ کر دے" ——— ہمیں دے کر ہماری وسعتِ قلبی کو آزمایا جاتا ہے ——— ہر عطائے ربانی نعمت ضرور ہے لیکن آزمائش بھی ہے ——— بڑی آزمائش ——— بے خبر نہ رہنا چاہیئے ——— تاریخ ہمارے سامنے ہے ——— قدم قدم پر عبرت کدے ہیں ——— جو نعمت دیتا ہے وہ اس طرح چھین لیتا ہے کہ آدمی ہکا بکا رہ جاتا ہے ——— اے بامرادو! نامراد پر طنز نہ کرو، ان کو حقیر نہ جانو ——— کبھی دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔

خلافت و فراست

مولائے کل نے فرشتوں سے فرمایا: "میں کائناتِ ارضی میں اپنا خلیفہ نامزد کر رہا ہوں" ——— فرشتوں نے عرض کیا "خدایا کیا تو اس کو خلیفہ بنا رہا ہے جو زمین میں فتنہ و فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا؟" ——— فرشتوں نے غلط نہیں کہا تھا اسی لئے ان کو جھٹلایا نہ گیا بلکہ ایک آزمائش میں مبتلا کر دیا گیا ——— علم و دانش کی آزمائش ——— اور اس آزمائش میں مبتلا کر کے بتلا دیا گیا کہ خلافت و حکومت کے لئے صرف نیکی و پارسائی کافی نہیں ——— بصیرت و بصارت اور علم و دانش کی بھی ضرورت ہے ——— ہر جاہل و غبی اس لائق نہیں کہ اس کو خلافت جیسی عظیم ذمہ داری تفویض کر دی جائے ——— بات معقول ہے ——— چھوٹے سے چھوٹے عہدے کے لئے بھی ہم انسانوں کو تولتے ہیں، امتحانات ہوتے ہیں، آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے، کچھ ناکام

ہوتے ہیں اور کچھ کامیاب، تب کہیں جاکر ذمہ داری سپرد کی جاتی ہے ——— جب طریقۂ کار یہ ہے اور بہت معقول طریقۂ کار ہے تو پھر خلافت جیسی عظیم ذمہ داری، علم و دانش کی آزمائش کے بغیر کیسے سپرد کی جائے ——— اسی لئے اقبال نے ایک مغربی مفکر کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا اور غالباً اسی مشاہدے اور خیال کے تحت کہا تھا ؎

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے

مگر جب خالقِ کائنات نے حضرتِ آدم علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنایا تو علم و دانش کی ترازو میں ان کو تولا گیا اور اس طرح فرشتوں کو خاموش کیا گیا ——— ابلیس کا موقف یہ تھا کہ تخلیقی اعتبار سے مجھ کو آدم پر فوقیت حاصل ہے ——— آدم کو مٹی سے بنایا گیا ہے اور مجھ کو آتش سے ——— مگر اس موقف کو سختی سے رد کر دیا گیا۔

ہر انتخاب کے لئے فرزانوں کو جمع کیا جاتا ہے پھر کیوں نہ اس عظیم انتخاب کے لئے فرزانوں کو جمع کیا جائے اور فرزانوں کی بات کو نظر انداز کر کے دیوانوں کے کہے پر عمل کیا جائے، یہ بات دل کو لگتی ہے ——— فرزانے کی ایک بات ہزار دیوانوں پر بھاری ہے ——— اسی لئے طریقت میں بھی سالک کو مجذوب پر برتری اور فوقیت حاصل ہے ——— مجذوب خود راہ پالیتا ہے، دوسروں کو راہ پر لگانا اس کا کام نہیں ——— مگر سالک خود بھی راہ پالیتا ہے اور دوسروں کو بھی راہ پر لگا سکتا ہے اسی لئے مجذوب سے زیادہ سالک کی بات مانی جاتی ہے اور مانی جانی چاہیئے، اگرچہ مجذوب کی بات بھی کبھی کبھی تیر بہدف ہوتی ہے اور ایسی تیر بہدف کہ بس دیکھا کیجئے لیکن سالک پھر بھی سالک ہے ——— اس کی بات ہی کچھ اور ہے ——— اسی کے لئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے " اتقوا فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ " (مومن کی فراست و دانائی سے بچتے رہنا کیونکہ وہ خدا کی روشنی سے دیکھتا ہے) غالباً اسی حدیث کے مفہوم کو علامہ اقبال نے یوں بیان فرمایا ہے ؎

تقدیرِ امم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

اختیار و اقتدار

انسان ناپختہ و نا تمام ہے، فانی و بے ثبات ہے ـــــ مگر پھر بھی جب کبھی اس کو عارضی اقتدار ملتا ہے اور کچھ قوت حاصل ہوتی ہے تو پھولا نہیں سماتا، کچھ بدل سا جاتا ہے اور جانے پہچانے اس کے لئے اجنبی بن جاتے ہیں ـــــ کرسی پر کیا بیٹھتا ہے کہ دماغ آسمان پر چڑھ جاتا ہے، تیور بدل جاتے ہیں ـــــ جس کے چہرے سے کبھی مسکاہٹیں پھوٹتی تھیں آج وہی چہرہ مہیب اور ڈراؤنا نظر آرہا ہے ـــــ ہر شخص سہما سہما معلوم ہوتا ہے ـــــ اللہ اللہ یہ عارضی اقتدار، جس کو دے کر یہ کہہ دیا گیا کہ وقتِ مقرر پر چھین لیا جائے گا (یعنی ریٹائر کر دیا جائے گا) ـــــ اور کبھی وقت سے پہلے بھی چھین لیا جاتا ہے ـــــ ہاں اس عارضی اقتدار پر یہ گھمنڈ؟ ـــــ بڑی تنگ ظرفی کی بات ہے ـــــ عالی ظرف انسان وہ ہے جو اقتدار ملنے کے بعد اور دلربا ہو جائے ـــــ خدا کا شکر ادا کرے کہ مجھ جیسے عاجز انسان کو کیا سے کیا بنا دیا، مجھ جیسے ہزاروں انسان بیکس و مجبور مارے مارے پھرتے ہیں اور مجھ کو صاحبِ اختیار بنا کر ان بیکسوں کا سہارا بنا دیا ـــــ میں مخدوم نہیں خادم ہوں ـــــ یہ کیسی ناشکر گزاری ہوگی کہ جس خدا نے مجھے یہ عزت دی، میں اس کے بندوں سے اس طرح منہ پھیر لوں! نہیں نہیں میں فریبِ اقتدار کے اس پردے کو چاک کر دوں گا اور خدا کے بندوں سے فرعونوں کی طرح نہیں انسانوں کی طرح ملوں گا اور ان کے دکھ درد میں شریک رہوں گا۔

انسان نشۂ اقتدار میں چور ہو کر اس حقیقت سے آنکھیں بند کر لیتا ہے کہ رات دن میں ایک بار وہ یقینی طور پر بیکس و مجبور بنا دیا جاتا ہے ـــــ جابر سے جابر سلطان اور عاجز سے عاجز انسان خوابِ غفلت میں سلا دیا جاتا ہے ـــــ اور پھر واحدِ قہار اعلان فرماتا ہے۔

"ہاں وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ و پائندہ ہے، نہ

اس کو اُونگھ آتی ہے اور نہ نیند "

سونے والے سوتے رہتے ہیں مگر وہ جاگتا رہتا ہے۔ پھر ہمارے اختیار و اقتدار کی حقیقت کیا ہے! جاگ جائیں تو مختار اور سو جائیں تو بیکس و مجبور ——— یہ بھی کوئی اختیار و اقتدار ہے؟ پھر ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے

سب انسان مشیتِ ایزدی کے تابع ہیں ——— کوئی کسی کا تابع نہیں بنایا گیا ——— قرآن نے جو یہ کہا ہے کہ " خدا کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور تم میں جو صاحبِ حکومت ہو اس کی اطاعت کرو " ——— تو اس سے مقصود تین علیحدہ علیحدہ اطاعتیں نہیں، بلکہ مقصود و مطلوب ایک ہی اطاعت ہے اور وہ خدا کی اطاعت ہے ——— اسی لئے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے مسندِ خلافت پر متمکن ہو کر یہ ارشاد فرمایا تھا اور بجا ارشاد فرمایا تھا:۔

" جب تک میں اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کروں، تم میری اطاعت کرو، جب میں خدا اور رسول کی نافرمانی کروں تو تم کو میری اطاعت کی ضرورت نہیں "

اس لئے کہ اطاعت سے مقصود بالذات انسان کی اطاعت نہیں بلکہ خدا کی اطاعت ہے ——— غور کرو اسلام کے اس تصورِ اطاعت نے انسان کو کتنا عالی مرتبت بنا دیا ہے ——— وہ انسان جو مظاہرِ قدرت کے سامنے سرِ نیاز خم کیا کرتا تھا اس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ——— جب اطاعت کا یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے تو پھر انسان اکڑنے کے بجائے، سر جھکا کر چلتا ہے ——— اسی لئے قرآنِ کریم نے خدا کے نیک بندوں کی ایک نشانی یہ بتائی ہے کہ " جب زمین پر چلتے ہیں تو جھک کر چلتے ہیں " ہاں وہ حضرات جنہوں نے اقتدار و حکومت کے باوجود اس جذبۂ اطاعت کی حکمت کو سمجھا ہے، اپنے دورِ حکومت اور دورِ خلافت میں نہایت

منکسر المزاج رہے ہیں ——— شاہی کی لیکن فقیروں کی طرح بسر کی ——— حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی زندگی میں بہت سے ایسے واقعات نظر آئیں گے ——— ایک جلیل القدر خلیفہ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے وہ کام کئے کہ آج ایک معمولی افسر اور معمولی عالم بھی اپنے لئے کسرِ شان سمجھے ——— بھوکی رعیت کے لئے اپنے سر پہ اناج اٹھا کے لے جانا کوئی آسان کام نہیں مگر جلالِ خلافت کے ہوتے ہوئے حضرتِ عمر نے یہ بھی کر دکھایا۔ (رضی اللہ عنہ)

معدلت گستری

عدل و انصاف بارانِ رحمت ہے جس سے معاشرے کی کھیتی پھلتی پھولتی ہے ——— مگر اس کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے ——— یہ کوئی آسان کام نہیں ——— پھر جب اپنے یا اپنے کسی عزیز کے خلاف بات آپڑے، اور بھی کٹھن ہے لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس نازک موقع پر بھی قلم اٹھایا جائے اور جو بھی فیصلہ ہو، برملا کر دیا جائے، کسی کی رو رعایت نہ کی جائے ——— عدلِ فاروقی دیکھئے ——— شاید دنیا ایسا عدل و انصاف نہ دیکھ سکے گی ——— فرزندِ دلبند ایک جرم میں ماخوذ ہوئے ——— کوڑوں کی سزا سنائی گئی ——— ایک دو نہیں اکھٹاسی کوڑے ——— مگر کس کو یارا کہ خلیفۃ المسلمین کے جگر گوشے پر ہاتھ اٹھائے ——— جب کسی نے ہمت نہ کی تو رب کی ہمت جواب دے گئی تو اپنے ہاتھ میں کوڑا لیا اور لختِ جگر پر پے در پے مارنا شروع کر دیا ——— دیکھنے والوں کے دل مچلے جاتے تھے مگر دستِ فاروقی رکنے کا نام نہ لیتا تھا ——— ادھر اسی کوڑے پورے ہوئے اُدھر فرزندِ دلبند جاں بلب ہوئے ——— اپنے زانو پر سر رکھا کہ اب یہ گنہگار نہیں، سزا نے اس کو مصفّٰی و مجلّٰی کر دیا ہے ——— مگر دیکھتے ہی دیکھتے قفسِ عنصری سے روح پرواز کر گئی ——— اللہ اللہ شریعت کی پاسداری ہو تو ایسی ہو ——— کیا تاریخِ عالم عدل و انصاف کی ایسی نظیر پیش کر سکتی ہے؟

قرآنِ کریم نے عدل کا معیار یہ رکھا ہے کہ اگر فیصلہ اپنے والدین کے خلاف بھی ہو تو ذرا نہ ہچکچایئے، برملا فیصلہ کر دیجئے خواہ دشمن ہی کے حق میں کیوں نہ ہو ——— اپنوں کو بچا لینا اور

زبردستوں کو چھوڑ دینا تقاضائے انصاف نہیں ــــــ اس طرزِ عمل سے خوشگوار اور پُرامن ماحول پیدا ہو ہی نہیں سکتا ــــــ اسی لئے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے مسندِ خلافت پر جلوہ گر فرمایا تھا اور کیا خوب فرمایا تھا :

"جو تم میں کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے، انشاء اللہ اس کا حق دلاؤں گا ــــــ جو تم میں قوی ہے وہ میرے نزدیک ضعیف ہے، انشاء اللہ اس سے حق لے کر چھوڑوں گا"

امیرالمؤمنین کا عزم و حوصلہ دیکھئے ــــــ اے کاش معدلت گستری کی اس راہ پر ہم بھی گامزن ہو سکیں!

عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک شریف گھرانے کی عورت نے چوری کی، جرم ثابت ہو گیا، حکم دیا گیا کہ ہاتھ کاٹ دیا جائے کہ دوسروں کو عبرت ہو ــــــ دورِ جدید کی طرح وہاں زنداں کے خلوت کدوں میں سزا نہ دی جاتی تھی ــــــ کسی کو کیا خبر! ــــــ سزا عبرت بنے تو کیسے بنے! ــــــ اسلامی سزاؤں میں یہ نکتہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ وہاں سزا سے اصلاحِ معاشرہ مقصود ہوتا ہے ــــــ یہ سزا معاندانہ نہیں مصلحانہ ہوتی ہے ــــــ شریعت کو مجرم سے عناد نہیں ــــــ اس کے پیشِ نظر تو اصلاح اور صرف اصلاح ہے ــــــ کسی کو خلوت کدے میں اذیت پہنچا کر معاشرے کی اصلاح قطعاً ناممکن ہے ــــــ ہاں تو عرض کر رہا تھا کہ حکم دیا گیا کہ مجرمہ کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، شریف گھرانے کی عورت تھی معمولی بات نہ تھی؛ شرفاءِ مکہ جمع ہوئے اور دربارِ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سفارش کے لئے پہنچے ــــــ عرض کیا کہ اگر اس کو سزا دی گئی تو سارے کا سارا گھرانہ بدنام ہو جائے گا ــــــ معلوم ہے یہ سن کر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا، سنو! سنو! آپ نے فرمایا :

"خدا کی قسم! اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی ہوتی تو اس کا ہاتھ بھی کاٹا جاتا"

اس کے بعد فرمایا اور کیا عجیب نکتہ ارشاد فرمایا :

"پچھلی قومیں اس لئے تباہ ہوئیں کہ جب ان میں کوئی بااثر انسان جرم کرتا، چھوڑ دیا جاتا، غریب و بے بس جرم کرتا، پکڑ لیا جاتا۔"

لیعنی جس پر بس چلتا پکڑ لیا جاتا، بس نہ چلتا، چھوڑ دیا جاتا ——— یا یوں کہئے جس کو دل چاہتا پکڑ لیا جاتا اور جرم سزا کے تناسب کو پیشِ نظر رکھے بغیر جو سزا چاہتے دے دیتے ——— یہ معدلت گستری نہیں، ہوس پرستی ہے اور عدل و انصاف میں ہوس کا مطلق دخل نہیں ——— دنیا میں جہاں کہیں عدل و انصاف کی اس طرح مٹی پلید ہو، معاشرے کا سدھرنا مشکل ہے ——— مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اور پھر ہر فرد کا دل سے مطیع و فرمانبردار ہونا امرِ محال ہے ——— ایسے معاشرے میں خلوص کی جگہ ریا لے لیتی ہے، اطمینان و سکون کی جگہ خوف اور امن و امان کی جگہ فتنے۔

احتساب و اکتساب ہر شخص اپنے اعمال کا جواب دِہ ہے، ہاں سب اپنے خدا کے آگے جوابدہ ہیں ——— جو قدم قدم پر یہ خیال رکھے گا وہی کچھ پائے گا ——— اگر جوابدہی اور محاسبہ کا کھٹکا نہ رہے تو انسان فرعون بے سامان بن جائے اور فیلِ بے مہار کی طرح ہر کس و ناکس کو روندتا پھرے ——— نبیِ محترم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون پاکباز و معصوم ہوگا مگر دیکھو وہ بھی محاسبے اور جوابدہی کے خوف سے لرزاں و ترساں ہیں ——— اپنے خدا ہی کے سامنے جوابدہ نہیں ——— عالی ظرفی تو دیکھو کہ اپنے جانثاروں کے سامنے بھی جواب دہ ہیں، جو کہتے ہیں کر دکھاتے ہیں ——— باتوں سے دلوں کو رام نہیں کیا جاسکتا، یہ بات تو عمل سے پیدا ہوتی ہے۔

دنیا سے کوچ فرما رہے ہیں ——— وقت آپہنچا ہے ——— جانثاروں سے الوداعی ملاقات ہو رہی ہے ——— ایک ہی مجلس میں آقا اور غلام بیٹھے ہیں ——— آقا فرما رہے ہیں ——— "اگر کسی کے ساتھ کچھ زیادتی ہو گئی ہو تو میں حاضر ہوں، بدلہ لے لے!" ——— یہ آواز کیا آئی کلیجے پھٹ گئے، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ——— مگر ایک

گوشے سے ہمت کر کے ایک غلام آگے بڑھتا ہے ——— حاضرین سکتے میں رہ گئے ———
وہ غلام آقا سے مخاطب ہو کر کہتا ہے :۔

"ایک دن آپ کے دستِ مبارک سے میری پیٹھ پر چابک لگا تھا۔"

فرمایا :۔

"آؤ بدلہ لے لو!"

غلام آگے بڑھتا ہے ——— حاضرین حیرت زدہ ہیں کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے، غلام آقا کے قریب پہنچتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ "جس وقت چابک لگا تھا میری پیٹھ ننگی تھی ——— آقا اپنا پیراہن اُلٹ دیتے ہیں ——— پیراہن ہٹنا تھا کہ غلام نے آگے بڑھ کر مہرِ نبوت کو چوم لیا اور کامیاب و کامران اُلٹے پاؤں واپس آ گیا۔

آپ نے دیکھا آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کچھ کر کے دکھا دیا دنیا کے کسی آقا نے نہ دکھایا ہو گا ——— کس کی مجال جو اس رؤف و رحیم سے بدلہ لے مگر نہیں وہ اپنے بدلہ لینے والوں کے لئے بھی رؤف و رحیم ہیں۔

بیعت الرضوان کے موقع پر کیا کچھ نہ ہوا ——— معاہدے کے نکات پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سخت اعتراض فرمایا اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی ترش روئی اور تلخی کے ساتھ سوال و جواب کئے جس کا ہمیشہ ان کو قلق رہا ——— مگر قربان جائیے اس رحمتِ عالم کے، اپنے جانثاروں کا کیسا لاڈ پیار کیا! کوئی کر کے تو دکھائے!

کچھ نہ فرمایا بس یہی فرمایا کہ جو کچھ کیا گیا، درست ہے ——— اُلٹے قدموں مدینہ لوٹے، تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ سورۂ فتح نازل ہو گئی اور یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ محمدِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا تھا بجا و درست تھا ——— وحیِ الٰہی نے معاہدے کی توثیق کر دی اور دنیا والوں کے کانوں نے فتح و نصرت کے شادیانے بجتے بھی سنے ——— مکہ فتح ہوا اور اس شان سے فتح ہوا کہ بس دیکھا کیجئے۔

جواب دہی اور محاسبے کے لئے ہر وقت تیار رہنا اور فرعونِ بے سامان نہ بننا ——
ایک انسان کی سب سے بڑی خوبی ہے اسی لئے انسانِ کامل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ مبارکہ کا یہ پہلو نہایت تابناک ہے —— ان کے غلاموں کا حال پڑھئے، یہاں بھی عکسِ جاناں نظر آتا ہے —— خلیفۃ المسلمین حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدعا علیہ کی حیثیت سے مدینے کی عدالت میں حاضر ہیں اور دنیا کو بتا رہے ہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا انسان اپنے خدا کے سامنے بھی جواب دہ ہے اور عدالت کے سامنے بھی —— وہ معصوم نہیں، اگر جواب دہی کا یہ کھٹکا نہ لگا ہے تو پھر قوت و اقتدار ملنے کے بعد انسان کے جو جی میں آئے کرتا پھرے، کوئی روک ٹوک نہ ہو ایسے انسان کے پاس لوگ کھنچ کھنچ کر آئیں گے بلکہ ڈر ڈر کے بھاگیں گے کہ کہیں پکڑ نہ لے۔

دلوں کو جیتنا بہت مشکل ہے —— یہ بات اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ٹھنڈے دل سے دوست و دشمن سب کی سنے اور ہر وقت ہر ایک کے سامنے جواب دہی کے لئے تیار رہے خصوصاً اپنے رفیقوں اور غمخواروں کے سامنے —— جسموں پر حکومت کرنا بہت آسان ہے —— مگر تیر و تفنگ کے ذریعہ جسموں پر حکومت کرنے والے مٹ گئے اور تلخ یادیں چھوڑ گئے —— ہاں دلوں پر حکومت کرنے والے رہ سکے کہ ان کی یادیں اب بھی بہارِ جسم و جاں ہیں۔

معلم و متعلم

خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ نے فرمایا تھا ؎

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا!
ہم سبھی مہمان تھے اک تو ہی صاحب خانہ تھا

لیکن اب کایا پلٹ چکی ہے، مکتب و مدرسے میں خدا کی میزبانی اور ہماری مہمانی ختم ہو چکی ہیں، وہ ماحول نہیں، وہ فضا نہیں جس میں انسان بنتے تھے —— شاندار عمارتیں، عمدہ فرنیچر، نصاب دیکھو تو بے مصرف، استاد دیکھو تو بے فیض، انسان بنے تو کیونکر بنے؟

پہلے ہر تعلیمی ادارے کا ایک مزاج ہوتا تھا ——— طالب علم اسی مزاج سے جانا پہچانا جاتا تھا ——— پاک و ہند کے طول و عرض پر نظر ڈالیے اور مختلف ممتاز تعلیمی اداروں کا جائزہ لیجئے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آئے گی ——— لیکن اب کسی ادارے کا کوئی مزاج نہیں، تقریباً سب کے مزاج خراب ہیں ——— جب نصاب کی تدوین میں بصیرت و بصارت کو نظر انداز کر دیا گیا ہو، جب استاد خلوص و محبت سے مبرا ہو تو پھر یہی کچھ ہوگا ——— فکر و نظر میں انقلاب کی ضرورت ہے، جذبۂ ایثار کی ضرورت ہے تاکہ ہم کچھ کر سکیں اور پھر کچھ بن سکیں۔

ایک شریر، شوخ و چنچل طالب علم تحصیلِ علم کی منزلوں سے گزر کر جب استاد بنتا ہے تو اس کو معلمی کے پرانے معیاروں سے پرکھا جاتا، اور پرانے پیمانوں سے ناپا جاتا ہے ——— مگر یہ قطعاً ناممکن ہے کہ ایک شوخ چشم، چشم زدن میں سنجیدہ و بردبار، پیکرِ صدق و صفا اور مجسمۂ اخلاق و باوقار بن جائے ——— اس کے لئے مسلسل ریاضت کی ضرورت ہے ——— اس کے لئے ایک ایسے ادارے کی ضرورت ہے جہاں نہ صرف مفید تعلیم حاصل کی جا سکے بلکہ اس کے علاوہ بھی اور کچھ حاصل کیا جا سکے۔

غالباً دورِ جدید کے معلم و متعلم کی بدحالی کو دیکھ کر علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

اہلِ دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ
شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

کہتے ہیں کہ طالب علم رعایت کا مستحق ہے ——— بیشک مخصوص رعایتوں کا مستحق ہے ——— مگر وہ معاشرے کا ایک فرد ہے ——— اس کو وہ ساری ذمہ داریاں پوری کرنی ہیں جو اس پر عائد ہوتی ہیں بلکہ بدرجۂ اتم کہ وہ علم و دانش کی راہ پر گامزن ہے ———

وہ امام معصوم نہیں مگر کہلا ہوتا یہ ہے کہ اس کا جرم، جرم نہیں —— اس کی گستاخی گستاخی نہیں —— اس کی بد خلقی، بد خلقی نہیں —— اس کی بے ادبی، بے ادبی نہیں —— غرض اس کا کوئی گناہ، گناہ نہیں —— یہاں لغت اُلٹ جاتی ہے —— ذرا غور تو کرو یہ طرزِ فکر کہاں تک درست ہے؟ —— عقل و شعور اس کی نفی کرتے ہیں۔

ایک وہ زمانہ تھا جب طالب علم کے متعلق یہ سوچا بھی نہ جا سکتا تھا کہ وہ مجرم، بد خلق، بے ادب اور گستاخ ہو سکتا ہے —— لیکن اب حال یہ ہے کہ لوگ ان کی شرارتوں، بد خلقیوں سے ان کو پہچانتے ہیں —— جہاں شریروں کی ٹولی دیکھی بَرملا کہہ دیا "میاں کالج کے لڑکے ہیں"

مقامِ صد اَلم ہے کہ علمی شرافت و متانت یوں رخصت ہو گئی! —— اے یارانِ وطن آؤ یہ عہد کریں کہ ہم اس شرافت کا دامن تار تار نہ ہونے دیں گے، یہ ہماری آبرو ہے، یہ ہماری زندگی ہے!

تہذیب و تمدّن

تہذیب و تمدّن جامد نہیں متحرک ہیں —— یہی کیا کائنات کی ہر شئے متحرک ہے —— ہر شئے انقلاب بداماں ہے —— خود جسمِ انسانی میں انقلاب پہ انقلاب چلے آتے ہیں اور انسان کو احساس تک نہیں ہوتا —— اور یہ انقلاب معمولی نہیں، نہایت حیرتناک ہوتے ہیں۔

کوئی تہذیب و تمدّن نہ ایک حال پر رہی ہے اور نہ رہے گی —— کسی ایک تہذیب سے چپٹے رہنا اور مزاجِ عالم کے تیور نہ دیکھنا دانائی کی بات نہیں —— زمانہ خود مزاجوں کو تبدیل کرتا رہتا ہے اور نئے نئے راستوں پر لگاتار رہتا ہے۔

تہذیب و تمدن کی تشکیل و ترقی میں قوموں کے باہمی اختلاط کو بڑا دخل ہے —— اختلاط جتنا قوی ہوگا، اس کی تاثیر اتنی ہی شدید ہوگی —— ایک تہذیب دوسری تہذیب سے اور ایک تمدن دوسرے تمدن سے متأثر ہوتا ہے —— لینے دینے کا یہ عمل نہ معلوم کب سے

جاری ہے ——— کبھی لینے والا، دینے والے کی ہستی میں گم ہو جاتا ہے اور کبھی دینے والا لینے والے کی ہستی میں فنا ہو جاتا ہے اور کبھی لینے اور دینے والے دونوں ایک نئی آن بان کے ساتھ اٹھتے ہیں اور بڑھاپے میں جوانی کے مزے لوٹتے ہیں۔

تہذیب و تمدن کی علامات ہوتی ہیں ——— لیکن جب کائنات کے ابدی اصولوں کے تحت یہ علامتیں معدوم ہونے لگیں اور نئی علامات جنم لینے لگیں تو پھر نئی علامات کو خوش آمدید کہنا چاہیئے ——— رد کرنا عقل و خرد کے منافی ہے ——— تہذیب و تمدن خود بخود پھلتا پھولتا ہے، خود بخود پروان چڑھتا ہے مگر جس طرح کائنات کی ہر شے بالآخر موت کا شکار ہو جاتی ہے، یہ بھی موت کا شکار ہو جاتا ہے ——— ہزاروں تہذیبیں اور ہزاروں تمدن مدفون ہو چکے، آج ہم ان کا کھوج لگا رہے ہیں ——— اگر تہذیب ایک حالت پر رہتی، اگر تمدن کو قرار ہوتا تو کھوج لگانے کی نوبت نہ آتی۔

تہذیب و تمدن کے معاملے میں انسان کو وسیع النظر ہونا چاہیئے، دوسروں کی تہذیب و تمدن کا بھی احترام کرنا چاہیئے ——— یہ بات احترام انسانیت ہی کے ذیل میں آتی ہے۔ اپنی تہذیب و تمدن کو معیارِ شرافت و ایمان بنا لینا دانشمندی نہیں ——— زندگی میں ہم وہ ہزاروں چیزیں چھوڑ دیتے ہیں جو دوسروں کو مرغوب ہیں اور وہ ہزاروں چیزیں پسند کرتے ہیں جو دوسروں کو ناپسند ہیں، ردّ و قبول کا یہ جذبہ فطری ہے پھر تہذیب و تمدن کے معاملے میں اس فطری اصول کو نظر انداز کر کے اپنی تہذیب و تمدن اپنانے پر دوسروں کو کیوں مجبور کریں؟

ایک مسلمان کو اپنی تہذیبی اور تمدنی رفتار کو شریعت کی حدود میں رہ کر قائم کرنا ہوگا، یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں، مثلاً لباس کے متعلق عرض کیا جاتا ہے، اس کے لئے شریعت نے دو اصول قائم کئے ہیں:۔

۱۔ عورت اور مرد دونوں کے لئے جسمانی حدود اور آداب مقرر کر دئے، ان حدود میں رہ کر جو لباس پہنا جائے گا، شریعت کی نظر میں محمود و مرغوب ہوگا لیکن دوسری شرط کا ہونا ضروری ہے۔

۲۔ اس لباس کو اپنانے سے اُس کی (اس خاص علاقے میں جہاں وہ رہتا ہے) ملی اور مذہبی انفرادیت مجروح نہ ہوتی ہو، یعنی یہ لباس پہن کر بہر حال وہ مسلمان معلوم ہوتا ہے۔

اس معیار کو سامنے رکھ کر ہم کوئی بھی لباس اپنا سکتے ہیں ——— کسی کو کسی پر جبر کا اختیار نہیں دیا گیا ——— جب دین جیسی عظیم اور غیر فانی حقیقت کو اپنانے میں جبر کو روا نہ رکھا گیا ہو تو پھر تہذیب و تمدن جیسی عارضی اور فانی چیز کو اپنانے میں جبر کیسے روا رکھا جا سکتا تھا ——— جو لوگ اس معاملے میں جبر یا تنگ دلی سے کام لیتے ہیں، ان کو عقل اور شریعت کی روشنی میں اپنی اصلاح کرنی چاہیے اور ایک ایسے قانون کو جو فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے، محدود کر کے فطرتِ انسانی کا حریف نہ بنانا چاہیے۔

زبان و بیان

خدا نے زباں دی ——— دیکھنے میں پارۂ گوشت سے زیادہ کچھ نہیں
مگر زمانے پر حکمراں ہے ——— زبان ہی نہیں دی، بولنا بھی سکھایا

اور ساتھ ہی بولنے کا سلیقہ بھی بتایا ——— چرند و پرند سب ہی اپنی اپنی بولیاں بولتے ہیں مگر بولنے بولنے میں فرق ہے ——— ان کا بولنا اور ہے اور انسان کا بولنا اور ——— شاید دنیا بھر کے ایک ہی جنس کے چرند و پرند کے اشاروں کنایوں میں یکسانیت پائی جاتی ہو مگر نوعِ انسان کی زبانوں اور بولیوں میں وہ رنگا رنگی ہے کہ بس دیکھا کیجیے ——— اس بوقلمونی کو خالقِ کائنات نے اپنی نشانیوں میں شمار کیا ہے۔

سب زبانیں قدرتِ الٰہی کی نشانیاں ہیں ——— فطری ہمہ گیری اور قومی و مذہبی افادیت کے تحت ان کی قدر کی جانی چاہیے ——— اس میں سب کا بھلا ہے اور جس میں سب کا بھلا ہے وہی منظورِ خدا ہے ——— آفتاب بھی ہے، ماہتاب بھی ہے اور ستارے بھی ہیں، سب کا رنگ و رُوپ جدا جدا ہے ——— سب کی کشش الگ الگ ہے ——— وہ ستاروں کا پرستار نہیں جو ماہتاب کا منہ نوچ رہا ہے ——— وہ

ماہتاب کا دلدادہ نہیں جو آفتاب کے چہرے پر خاک ڈال رہا ہے ——— جس کو اللہ سے پیار ہے اس کو اِن تمام مظاہر سے پیار ہونا چاہیئے ——— اور جس کو خدا سے پیار نہیں وہ جہاں بھی چاہے چلا جائے " فانفذوا لا تنفذون الا بسلطان "

اس عالمِ رنگ و بو میں جب انسان آنکھیں کھولتا ہے تو ہر شے اپنی طرف کھینچتی نظر آتی ہے ——— زبانِ وطن، لباسِ وطن، در و دیوارِ وطن، ابنائے وطن ——— نوعِ انساں کے دل میں ان کی حفاظت اور ان سے پیار و محبت کا فطری جذبہ موجود ہے ——— بیشک ان سب کی پاسداری ہونی چاہیئے مگر اجزاء کی حفاظت میں کل سے بے خبر نہ رہنا چاہیئے ——— دانشمند وہی ہے جو اجزاء کی حفاظت کرتا ہے مگر اس کے سر میں کُل کی تعمیر کا سودا بھی رہتا ہے ——— ہاں بے خبر ہوئے تو پھر جس جنت کا خواب دیکھ رہے ہو وہ جنت نہ دیکھ سکو گے ——— دنیا ایک جہنم بن جائے گی جہاں دیکھنے کو تو جنتی نظر آئیں گے مگر ان کے قلب و دماغ میں ماءِ حمیم کھول رہا ہوگا ——— ان کی زندگی بظاہر طربناک و تابناک نظر آئے گی مگر حقیقت میں نہایت کربناک اور المناک ہوگی۔

ایمان و اسلام چھبیس ستائیس برس پہلے کی بات ہے ——— ریاست الور (راجپوتانہ، بھارت) کے ایک دیہات میں جانا ہوا، ایک مسلمان میواتی سے پوچھا "کلمہ جانتے ہو؟" ——— کہا "نہیں!" دریافت کیا "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جانتے ہو؟" جواب ملا کہ "محمد رسول اللہ کو تو نہیں جانتے، مسلمان ضرور ہیں" ——— سبحان اللہ! دیکھی آپ نے شانِ ایمان! عمارت موجود، بنیاد غائب ——— ایسی حیرت انگیز تعمیر تو شاید کسی نے نہ دیکھی ہوگی۔

عہدِ نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) میں جب چند مشرکینِ عرب مسلمان ہوئے اور انہوں نے کہا "آمنّا" (ہم ایمان لائے) تو فوراً وحیِ الٰہی نے ٹوکا اور ہدایت کی کہ "آمنّا" نہ کہو "اسلمنا" (ہم اسلام لائے) کہو ——— اسلام لانے اور ایمان لانے میں بڑا فرق ہے

——— ایمان کے لئے گہرے مشاہدے و مطالعے کی ضرورت ہے، بصیرت و بصارت کی ضرورت ہے، تزکیۂ نفس و قلب کی ضرورت ہے، دل میں بات اترنے کی ضرورت ہے، تب جا کر وہ خود بخود گی اور خود سپردگی پیدا ہوتی ہے جو جانِ ایمان ہے اور جب تک یہ بات پیدا نہیں ہوتی، ایمان کی حلاوت محسوس نہیں ہو سکتی ——— ہاں زبان سے کسی اصول کو اپنا لینا کچھ اتنا مشکل نہیں ——— اسی لئے قرآن کریم نے مومن و مسلم میں فرق کیا ہے اور یہ معمولی فرق نہیں، غیر معمولی ہے ——— اتنا ہی فرق ہے جتنا دل و زبان میں ہے۔

آج ہم اپنے حال کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے ——— "آمنا" والی بات تو بڑی بات ہے "اسلمنا" والی بات بھی پیدا نہیں ہوئی ——— کچھ اس حیوانی کا سا حال ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ جانتے ہوئے بھی خود کو مسلمان سمجھتا تھا ——— خدا اور رسول کی کوئی بات بھی اچھی نہیں لگتی، نماز روزے سے جی چراتے ہیں، دامِ اغیار میں گرفتار ہیں اور خوش ہیں ——— کوئی ایسا گرفتار نہ دیکھا جو اتنا خوش و خرم ہو ——— شاید چشمِ عالم نے بھی نہ دیکھا ہو ——— اس خود فریبی پہ ہزار حیف کہ گرفتاریوں کو آزادیوں پر ترجیح دے رہے ہیں اور اب تو یہ امید بھی نظر نہیں آتی کہ یہ خود گرفتار رہا ہو کر آشیاں کی طرف لوٹ جائیں گے ؎

کنجِ قفس میں لطف طلا جن کو وہ اسیر
چھوٹا بھی گر تو پھر نہ سوئے آشیاں گیا

ذات و کردار

اسلام کو انسان کی ذات سے دشمنی نہیں، ذات سے دشمنی کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ اس خالقِ کل کا پیغام ہے جس نے خود ذات کو پیدا کیا ہے ——— اسلام کو صرف اور صرف انسان کے کردار سے غرض ہے اور وہ بھی خود انسان کی اپنی منفعت کی خاطر ——— یہ نہایت معقول بات ہے جو اس دور میں بھی نہیں پائی جاتی جس کو عقل و حکمت کا دور کہا جاتا ہے، جس کو ترقی کا دور کہا جاتا ہے ——— اور ہاں یہ لفظ 'ترقی' بھی ایک معما ہے ——— اے کاش ہم اس کے صحیح معنی و مفہوم سمجھ سکتے!

اس ترقی یافتہ دور میں بھی ایسی مثالیں مل جائیں گی ——— ایک نہیں ہزاروں ——— جہاں ذاتی دشمنی کی بنا پر انسانوں کو لوٹا کھسوٹا گیا اور مٹا دیا گیا ——— مگر اسلام اس لوٹ کھسوٹ کی اجازت نہیں دیتا، وہ اصلاح فکر و خیال اور اصلاح کردار کا داعی ہے ——— اس کی دوستی و دشمنی ——— بلند خیالی و پست خیالی اور بلند کرداری و بد کرداری کی بنیاد پر ہے ——— جہاں فکر و خیال میں اصلاح ہوئی، سارے امتیازات مٹ گئے اور ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اور یہ بات صرف کہی نہیں گئی بلکہ کر کے بھی دکھا دیا گیا ——— آقا و غلام کو یک جا بٹھلایا گیا ——— بلکہ دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ غلاموں کو آقاؤں کا آقا بنا دیا گیا ——— یہ معمولی بات نہیں ——— کوئی کر کے تو دکھائے!

جہاد کہنے کو تو کشت و خون کی ایک صورت ہے ——— مگر یہاں بھی محرک، ذاتی دشمنی یا جوع الارضی نہیں، وہی اصلاح کردار، اصلاح فکر و خیال ——— جہاد کیا ہے، نوع انسانی پر شفقت کی ایک صورت ہے ——— مہر بلنداز قہر ——— جہاں اصلاح فکر و خیال کی امید نظر آئی، کشت و خون سے ہاتھ کھینچا ——— اور ہاں یہ بتاتا چلوں کہ یہ کشت و خون جس کو جہاد کہا جاتا ہے، سفاکانہ اور بہیمانہ نہیں ——— اس کے آداب و اصول ہیں جس کی پابندی ہر مجاہد پر فرض ہے ——— بربریت کے اس دور میں بھی مجاہدوں نے پابندی کر کے دکھائی جو تہذیب کے اس دور میں مفقود ہے ——— عرض یہ کر رہا تھا کہ جہاد ایک عالی مقصد کے لئے کیا جاتا ہے اور وہ صرف اصلاح فکر و خیال ہے ——— جہاں اصلاح کی صورت نظر آئی، تلواریں نیام میں چلی گئیں، کشت و خون یکلخت بند ہو گیا، دشمنوں کو معاف کر دیا گیا ——— نہ صرف یہ کہ معاف کر دیا گیا، ان کے گھروں کو دار الامان بنا دیا گیا ——— کیا چشم عالم نے فتح مکہ کا منظر نہ دیکھا جب وہ رحمت عالم مکہ معظمہ میں فاتحانہ اور فاخرانہ

داخل ہورہا تھا، دنیا یہ سمجھتی تھی کہ دشمنوں سے آج خوب خوب بدلے لئے جائیں گے لیکن دیکھو دیکھو اس رؤف و رحیم نے وہ کچھ کر کے دکھایا جو کسی مظلوم نے ظالم پر غالب آنے اور کسی مجبور نے جابر پر غلبہ پانے کے بعد نہ کیا ہوگا! ——— ایک عظیم اجتماع ہوتا ہے، دشمن موجود ہیں، لرزاں و ترساں ہیں، اچانک اعلان ہوتا ہے ——— جاؤ تم سب آزاد ہو ——— دیکھتے ہی دیکھتے گردن زدنی، کشتنی، سوختنی سب آزاد ہو گئے، سزا دنیا تو بڑی بات ہے کسی کو ٹیڑھی آنکھ سے نہ دیکھا ——— حقیقی عفو و درگزر وہ ہے جو دشمن پر غلبہ حاصل ہو جانے کے بعد کیا جائے ——— کسی مجبور نے جابر کو معاف کیا تو کیا کیا!

بات سے بات نکلتی جاتی ہے، چند روز ہوئے اخبار جنگ (کراچی مورخہ ۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء) ص ۹، کالم ۴ میں ایک خبر پڑھی، خبر کیا پڑھی آنکھیں کھل گئیں، دل روشن ہو گیا، اسلام کی حقانیت و صداقت کا نقش دل پر مرتسم ہو گیا، آیئے آپ بھی سنئے، پڑھا تو سب ہی نے ہوگا مگر ؎

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

بین الاقوامی مسائل جنگ کے موضوع پر قانونی کانفرنس کا اجلاس آئندہ سال اگست ۱۹۷۳ء میں آئیوری کوسٹ (افریقہ) میں ہونے والا ہے، اس کانفرنس میں تبادلۂ خیال کے لئے ایک مطالعاتی رپورٹ تیار کی گئی ہے جو دنیا کے ۱۲۰ ممالک میں بھیجی گئی ہے۔ پاکستان میں قانونی کانفرنس کی قومی کمیٹی کے چیئرمین چوہدری نذیر احمد خاں کو بھی یہ رپورٹ ملی ہے۔ اس رپورٹ میں مغربی فضلاء نے اس رائے کا اظہار کیا ہے:۔

۱۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو امن کا علمبردار ہے اور اپنے پیروؤں پر زور دیتا ہے کہ وہ غیر ضروری خون خرابے سے پرہیز کریں۔

۲۔ اسلام جدید بین الاقوامی قانون کے فلسفے اور جنگ کے قانون کا پیش رو ہے کئی صدیاں پہلے اس نے ایسے قوانین دیئے تھے جن میں جنیوا کنونشن اور اقوام متحدہ کا جذبہ

اور روح موجود تھی۔

بلکہ بقولِ اقبال اسلام "جمعیتِ اقوام" نہیں "جمعیتِ آدم" کا داعی ہے۔

ہاں تو ذکر تھا اصلاح فکر و خیال کا، اصلاح کردار کا ——— قرآنِ کریم کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ دلوں میں انقلاب پیدا کر دے، اس لئے وہ ذاتی دشمنیوں کو نہ جنم دیتا ہے نہ فروغ ——— تزکیۂ نفس اور عالمگیر محبت کے سوا اس کا کوئی پیغام نہیں ——— سارے آداب و اصول اسی ایک حرفِ محبت کے ارد گرد گھومتے نظر آتے ہیں ——— اقبال نے خوب کہا ہے ؎

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہاں گیری محبت کی فراوانی

وہ جو کچھ کہتا ہے اسی حرفِ محبت کی حفاظت کے لئے کہتا ہے جس کا منبع و سرچشمہ ذاتِ باری عزاسمہ ہے ——— وہ جسم کا نہیں، جان کا محافظ ہے ——— کیا جان کی حفاظت کے لئے اعضاءِ انسانی کاٹ کر نہیں پھینک دئے جاتے ——— مگر سرجن کے اس عمل کو کوئی سفاکی سے تعبیر نہیں کرتا، یہ عمل میں کرم شمار کیا جاتا ہے جو بظاہر قہر نظر آتا ہے ——— اسلام کی نظر میں نوعِ انسانی ایک جسم ہے ——— جب اس جسم میں فساد برپا ہوتا ہے تو کسی نہ کسی عضو کو کاٹنے کا حکم دیا جاتا ہے تاکہ جسم و جان دونوں محفوظ رہیں ——— مگر یہ قطع و برید ذاتی دشمنی کی بنیاد پر کبھی نہیں کی جاتی ——— اگر کی گئی تو وہ اسلام کے منشا کے قطعاً خلاف ہے۔

کروڑوں ہندو، ہندوستان کی طویل و عریض سرزمین پر بستے ہیں، تنگ نظری کا یہ عالم ہے کہ خود اپنے درمیان ذات پات کی تفریق ختم نہ کر سکے ——— دس کروڑ انسان جن کو اچھوت کہا جاتا ہے محض اس لئے نظر سے گرائے گئے کہ وہ عالی نسب نہیں ——— یہ المیہ بھی ہے اور المیہ بھی ——— عیسائیوں کو دیکھو قبولِ مذہب کے بعد بھی اخیار سے اس طرح گھلتے ملتے نہیں جس طرح ایک مسلمان گھلا ملا کرتا ہے ——— ہر مجلس میں تفریق و امتیاز قائم رہتا

ہے ——— یہ صرف مسلمان اور مسلمان ہے جس کے دل میں سب کی سمائی ہے ——— شاہ ہو، گدا ہو، فقیر ہو، امیر ہو، گورا ہو، کالا ہو، حاکم ہو، محکوم ہو، کچھ بھی ہو، فکر و خیال ہم آہنگ ہیں تو پہلو سے لگا کھڑا ہے ؎

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

آزادی یا گرفتاری

عورت کی آزادی و گرفتاری پر نہ معلوم کب سے بحث چل رہی ہے، اقبال نے بھی اس بحث و مباحثہ سے تنگ آکر کہا تھا ؎

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں، مردانِ خردمند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند؟

دورِ جدید کے روشن خیالوں کا کہنا ہے کہ جو شخص کسبِ معاش کی مصیبتیں جھیلتا ہے اور عورت کو آرام و آسائش سے گھر میں بٹھاتا ہے، صرف گھر کے کام کاج اور خانگی ذمہ داریاں اس کے سپرد کر کے خود خارا شگافی کرتا ہے وہ ظالم ہے اور یہ عورت مظلوم ہے ——— اور جو شخص کسبِ معاش کی مصیبتوں میں عورتوں کو ساتھ ساتھ رکھتا ہے، دربدر پھراتا ہے، حال سے بے حال کرتا ہے، اس کو عاشقانہ نظر سے نہیں، تاجرانہ نظر سے دیکھتا ہے، ہاں یہ شخص بڑا رحیم و کریم ہے اور یہ عورت آزاد و خود مختار ہے ——— ظلم و ستم اور رحم و کرم کی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ؎

ایک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

عورت کوئی معمولی شے نہیں محبوبِ محبوبِ رب العالمین ہے، یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں، پھر اس رحمتِ عالم سے کیسے توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ عورتوں کے لئے ایک نئی رسمِ ستم ایجاد کرے گا؟ ——— تاریخِ عالم پڑھو اور خوب غور سے پڑھو ——— عورت پہلے مظلوم

تھی، اس کی مظلومیت حد سے سوا تھی، یہ اسلام اور صرف اسلام کا احسانِ عظیم ہے کہ اس نے عورت کو ظالموں کے چنگل سے چھڑایا ——— وہ مجبور و مقہور تھی، اس کو محبوب و مطلوب بنایا ——— اب اگر وہ محبوبیت پر مجبوری کو ترجیح دے تو اس کا کیا علاج؟

گھر میں بیٹھنا اور گھر سنبھالنے کی بات کر رہا تھا اس میں پردے کی بات بھی آجاتی ہے ——— یاد آیا، پیرس کے ایک فاضل ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے پیرس میں عورتوں کی ایک مجلس میں پردے کی ایک عجیب اور دل لگتی حکمت بیان فرمائی جس نے ان عورتوں کو اتنا متاثر کیا کہ بعض نے برقعے تک اوڑھنے شروع کر دیئے ——— ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ پردے کی ایک حکمت یہ ہے کہ عورت کے حسن و جمال اور لطافت و نظافت پر آنچ نہ آنے پائے ——— جو اعضاء کھلے رہتے ہیں، ان کا رنگ اڑ جاتا ہے، جو چھپے رہتے ہیں ان کا رنگ و روپ قائم رہتا ہے ——— اللہ تعالیٰ عورت کو حسین و جمیل رکھنا چاہتا ہے ——— اس لئے اس کو محجوب رکھا گیا تاکہ حسن و جمال برباد نہ ہو ؎

آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ بے حجابی کے ساتھ ساتھ عورتوں کا حسن و جمال کافور ہو گیا، اسی لئے حسنِ عارضی کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں اور اس سامان پر اتنا کچھ خرچ کیا جاتا ہے کہ الامان والحفیظ! ——— ایک وہ حسنِ حقیقی ہے پسینے سے جس پر نکھار آتا ہے اور ایک یہ حسنِ عارضی ہے کہ پسینہ اس کے لئے پیامِ موت ہے۔

ہاں ذکر تھا آزادی و گرفتاری کا ——— آپ نے دیکھا کہ آزادی میں وہ بات نہیں جو گرفتاری میں ہے ——— اور دیکھا جائے تو ہر آزادی ایک معقول گرفتاری ہے اور مطلق آزادی حیوانیت سے زیادہ کچھ نہیں ——— ایک بات اور عرض کرتا چلوں جس معاشرے میں اور جس ضرورت کے تحت عورتیں باہر نکلی ہیں وہ قطعاً الرجال تھا لیکن ہمارے ہاں مردوں کی قلت نہیں کثرت ہے،

پھر یہ کیا تماشا ہے کہ مرد مارے مارے پھریں اور عورتیں اپنی ذمہ داریوں کو چھوڑ کر دفتروں میں نظر آئیں ——— اقبال نے خوب کہا ہے ؎

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

اور مشہور مؤرخ پروفیسر جے ٹائن بی لکھتا ہے :

" تاریخِ انسانی میں زوال کے ذمہ دار وہی تھے جب کہ عورت نے گھر کو خیرباد کہہ دیا ہے "

نگاہِ تیز نگاہ وہ ہے جو اپنے دامن میں برسوں کے مشاہدات و تجربات ایک آن میں سمیٹ لے اور نوعِ انسانی کو ایک طویل جد و جہد سے بچا کر آن کی آن میں اوجِ ثریا تک پہنچا دے ——— نوعِ انسانی کی حیرت انگیز ترقیاں اسی نگاہ سے وابستہ ہیں ——— سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے کبھی چشمِ عالم نے ایک صدی میں یہ حیرت انگیز ترقیاں نہ دیکھی تھیں، ڈاکٹر اسپرنگر نے صحیح لکھا ہے کہ جدید تحقیق و تلاش کا اصل محرک قرآنِ عظیم ہے، اس نے دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

اقبال نے جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو کچھ فرمایا، ہزار نعتوں پر بھاری ہے جلد چھوٹا سا ہے مگر دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے، اقبال نے لکھا ہے کہ آپ نے :

" انسانی مساعی کو مختصر سے مختصر کر دیا "

یعنی آنِ واحد میں وہ باتیں بتا دیں جو ہزار تجربات و مشاہدات اور برسوں کی کاوش کے بعد بھی معلوم نہ ہوتیں ——— دیکھا جائے تو نوعِ انسانی پر یہ ایک احسانِ عظیم ہے ——— اسی نکتے کی طرف ظفر علی خاں نے اشارہ کیا ہے اور خوب کہا ہے ؎

جو نکتہ دروں سے حل نہ ہوا اور فلسفیوں سے کھل نہ سکا
وہ رازِ اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

عائد ہے میں وہ رہے جنہوں نے صرف سیرت کو پرکھا، اس کی امانت و دیانت و صداقت کو دیکھا اور پھر جو کچھ اس نے کہا آنکھیں بند کر کے اُس پر عمل کیا اور سرِ تسلیم خم کیا ——— سرِ تسلیم خم نہ کرتے تو دنیا یہ حیرت انگیز انقلاب نہ دیکھ سکتی کہ ایک چرواہا آنِ واحد میں مسندِ خلافت پر بیٹھ مسائلِ عالم حل کر رہا ہے اور دنیا اس کی ہیبت سے لرزاں و ترساں ہے۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

بے نیازی و نیازمندی

ووٹ لینے والے ووٹ لینے کے لئے اخلاص و نیازمندی سے پیش آتے ہیں ——— مطلب نکل جاتا ہے تو بے نیازانہ گزر جاتے ہیں، اس طرح منہ پھیر لیتے ہیں کہ لوگ صورت ترستے رہ جاتے ہیں ——— لیکن آج کل یہ بات کچھ کم نظر آتی ہے ——— دنیوی سیاست کے آداب یہ ہیں کہ گھر گھر جائیے، در بدر پھریئے، اپنی تعریف کیجئے، زمین و آسمان کے قلابے ملائیے، جھوٹے سچے وعدے کیجئے، عاجزی و انکساری دکھائیے، غرض منگتا جو کچھ کرتا ہے وہ سب کچھ کیجئے ——— آدابِ فقیری نہ بھولیئے ——— اور جب کام نکل جائے تو پھر پلٹ کر نہ دیکھئے، کوئی دیکھنے کی کوشش کرے تو اس کو اس طرح گھور کر دیکھئے کہ دم ہی نکل جائے ——— قریب نہ جائیے، دور دور رہیئے، ہاں سڑکوں سے گزرتے وقت ہاتھ ہلا ہلا کر جانثاروں کو سلامی دیجئے اور خوش کر دیجئے۔

لیکن اسلامی سیاست یہ کہتی ہے کہ کسی کے پاس منگتا بن کر نہ جائیے ——— لوگ بلائیں اور آ آ کر منائیں تو جائیے ——— منہ سے کچھ نہ بولیئے، کام کر دکھائیے، اتنے قریب ہو جائیے کہ دور سے ہاتھ ہلانے کی نوبت ہی نہ آئے ——— جو نعمت ملے اس میں سب کو شریک جانیئے، ہر چند مخدوم ہوں، خود کو خادم سمجھیئے، ہر چند مطلوب ہوں، خود کو طالب جانیئے موٹا جھوٹا پہنیئے، فرشِ خاک پر بیٹھیئے اور فرشِ خاک پر ہی سوئیے۔

تاریخِ اسلام دیکھو، ہمارے اسلاف نے فرشِ زمین پر بیٹھ کر وہ کچھ کر دکھایا جو ہم کرسیوں پر بیٹھ بیٹھ کر بھی نہ دکھا سکے ——— ان کے پاس اخلاص تھا، للّٰہیت تھی، وہ بندوں سے بے نیاز تھے، صرف خدا کے نیازمند تھے، ہم خدا سے بے نیاز ہیں اور بندوں کے نیازمند، ہم ایک ایک

کے آگے جھکتے ہیں وہ صرف خدا کے آگے جھکا کرتے تھے اور جو خدا کے آگے جھک گیا پھر اس کو کسی کے آگے جھکنے کی حاجت نہیں ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

رسول اور دشمنِ رسول

جس سے محبت ہوتی ہے اُسی کی بات مانی جاتی ہے، اُسی کے طریقے کو اپنایا جاتا ہے اور نمونۂ حیات بنایا جاتا ہے ——— یہی سیدھا سادا اصول ہے، قرآنِ کریم نے بھی اسی اصول پر قوت اور آئینِ محبت کو پیش کیا ہے ——— اس نے اطاعتِ رسول کا حکم دے کر رازِ محبت فاش کر دیا ہے ——— لیکن ہمارا حال عجیب ہے، رسول کی ہر ادا سے گریزاں اور دشمنِ رسول کی ہر ادا پر دل و جان سے قربان ——— چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے، پہنتے اوڑھتے، رہتے سہتے، غرض کسی حال میں رسول کی اداؤں پر نظر نہیں مگر ملتے منتظر رہیں، قربان جائیے اس تسلیم و رضا کے!

نہ صرف یہ کہ رسول کی ادائیں نہیں بھاتیں بلکہ اب تو بات یہاں تک پہنچی ہے کہ ان اداؤں کو اپناتے کچھ شرم سی آتی ہے اور دشمنِ رسول کی اداؤں پر مرمٹنے کو جی چاہتا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون ——— یاد آیا، ایک دعوت میں شریک تھا، لوگ کھڑے ہو کر کھا رہے تھے، میں کرسی لے کر ایک طرف بیٹھ گیا، ایک عزیز نے فرمایا "آپ بیٹھ کر کھا رہے ہیں اور سب کھڑے ہو کر، شرم آرہی ہے" ——— سبحان اللہ غیرت کی انتہا ہے کہ کھا میں رہا ہوں اور شرم ان کو آرہی ہے ——— احقر نے عرض کیا "جب اس بے شرم کو شرم نہیں آتی جو سنتِ رسول کا عملاً مذاق اڑا رہا ہے تو مجھے کیوں شرم آنے لگی میں تو سنت پر عمل کر رہا ہوں" ——— جب تک اطاعتِ رسول میں بے خودی و خود باختگی کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، کام نہیں بن سکتا، عاشق کہیں بھی ہو اس کی محبوب اور صرف محبوب پر نظر رکھنی چاہئے ؎

عجب چیز ہے لذتِ آشنائی ——— دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو

ذرا مشرقی ہند کو دیکھو، ہزار برس ہمارے حکمران رہے اور سو برس انگریز کے مگر اپنی آن نہ چھوڑی، وہی دھوتی، وہی چوٹی، وہی سادگی، وہی ٹوپی ——— وزیر ہو یا فقیر سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے، ہم مسلم کے دعویدار اور کرتوت ایسے کہ کافر ہندی بھی شرمائے ——— خدارا وہ بات پیدا کیجئے اور وہ لگن پیدا کیجئے جو انسان کو دو عالم سے بے نیاز کرکے صرف ایک طرف متوجہ کر دیتی ہے ——— اسی توجہ کی ضرورت ہے اسی والہانہ جذبۂ اطاعت کی ضرورت ہے ؎

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

نصیحت و عبرت

انسان کیسی کیسی بلندیوں تک پہنچتا ہے لیکن پھر سراپا عبرت بنا دیا جاتا ہے ——— بادشاہ بھی ہوئے وزیر بھی بنے، اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے ملے، بیکراں دولت ملی، بے حد ثروت ملی لیکن ؎

آخر کار جب جہاں سے گیا
ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا

اللہ اللہ یہ کیسی عبرت کا مقام ہے! ——— قدم قدم پر نصیحت و عبرت ہے ——— ہر جانے والا، رہنے والوں کے لئے عبرت ہے لیکن کچھ ایسی آنکھیں مُندی ہیں کہ نظر ہی نہیں آتا، ——— حدیث پاک میں انسان کی بے حسی کا کیسا عبرتناک نقشہ کھینچا ہے، فرمایا "انسان اپنے مرحوم عزیز کو سپردِ خاک کرکے کچھ اس اطمینان سے واپس لوٹتا ہے کہ جیسے اسے مرنا ہی نہیں" ——— حالانکہ اطمینان کیسا، دل پھٹنے کی جا ہے! شاعر نے کیسی ہائے کی ہے ؎

ہائے ظالم وہ کیا جگہ ہے جہاں
پانچ جاتے ہیں، چار پھرتے ہیں؟

اے ہاں اگر مرحوم بادشاہ یا وزیر، عہدیدار یا دولت مند و جاگیردار ہے تو ماتم رفتگاں ایک طرف جانشینی اور دولت و جاگیر سمیٹنے کے لئے پسماندگان لڑتے مرتے نظر آئیں گے ———

وہ عہد سے جن پر وہ اکڑا کرتا تھا اور وہ دولت جو گن گن کر رکھا کرتا تھا آج عبرت بنی ہوئی اس کا ماتم کررہی ہے ——— پھول کھلتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں، قدم قدم پر عبرت کدے ہیں لیکن کوئی عبرت حاصل نہیں کرتا، عراقی نے زندگی کی بے وفائی اور دنیا کی بے ثباتی کا کیسا المناک نقشہ کھینچا ہے اور کس دلنشیں انداز سے! ——— آپ بھی سنئیے ؎

رباعی

گل بہ سحرم بر آشفت و بریخت
با باد صبا حکایتے گفت و بریخت
بد عہدی عمر بیں کہ گل در دہ روز
سر برزدہ غنچہ گشت و بشگفت و بریخت

یک رنگی و دو رنگی ہمارا پورا معاشرہ دو رنگی کا شکار ہے ——— لیکن یک رنگی کی بات کچھ اور ہی ہے، اقبال نے خوب کہا ہے ؎

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ
یک رنگی و آزادی اے ہمت مردانہ

ذرا غور کیجئے ہمارے معاشرے میں ایک شخص بیک وقت دو کام کرتا ہے ——— ایک وہ جس سے رحمٰن خوش ہو اور دوسرا وہ جس سے شیطان خوش ہو ——— اس کا نام مسلمانی نہیں، مسلمانی عبارت ہے یک رنگی سے ——— صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً؟

جہاں جاتے ہیں وہاں کی سی کہتے ہیں ——— رقص و سرود کی محفل میں گئے، اس کے محامد بیان کئے ——— محفل قراءت میں پہنچے قرآن کے فیوض و برکات پر روشنی ڈالی ——— مجلس عید میلاد النبی میں گئے، سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ——— فلستان میں گئے، اس کی اہمیت بیان کی ——— ہم جگہ واہ واہ ہوئی! ——— ہر بول سے عیاں ہے کہ کہاں سے بول رہے ہیں، اقبال نے کہا تھا ؎

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

لیکن اس دور میں نغمۂ لا الٰہ پابندِ محبس کر دیا گیا ہے، ہر جگہ اللہ اللہ کی باتیں نہیں ہوتیں، کہیں شیطان روڑہ نہ جائے ——— ریڈیو اور ٹی وی کے پروگرام کا آغاز تلاوتِ قرآنِ پاک سے ہوتا ہے لیکن اس آغاز کا انجام کیا ہوتا ہے؟ کچھ نہ پوچھئے!

اور ذرا علمی اداروں پر نظر ڈالئے ——— یہاں بھی دورنگی کا سماں نظر آئے گا ——— غیر نصابی سرگرمیوں کے بہانے وہ کچھ ہوتا ہے جو کم از کم ایک علمی ادارے میں نہ ہونا چاہئے ——— مغرب میں ہوتا ہے، ہوا کرے، ہمارا قومی مزاج و کردار ہی علیحدہ ہے ——— اس کے تقاضے مغرب سے قطعاً مختلف ہیں، مغرب کو امام نہ بنانا چاہئے ——— جو کچھ ہوتا ہے دیکھ دیکھ کر ہنسی آتی ہے لیکن چونکہ ہوتا چلا آیا ہے اس لئے ہوتا رہے گا ——— ماشاء اللہ سب ہی مقلد ہیں، کوئی مجتہد نہیں کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔

ایک لطیفہ یاد آیا ——— کسی دیہات میں تبلیغِ دین کے لئے ایک مولوی صاحب تشریف لے گئے ——— مسلمانوں کو نماز کی ہدایت کی، نماز کسی کو نہ آتی تھی، پڑھتا کون؟ ——— بجبور مولوی صاحب نے فرمایا "میں نماز پڑھتا ہوں، جو کرتا جاؤں تم بھی کرتے جانا" ——— مولوی صاحب امام بنے، نیت باندھی، کھڑے ہو گئے ——— خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جب رکوع میں گئے تو لنگیر پھوٹ گئی ——— دیہاتی مسجد تھی، اندر پانی کا انتظام نہ تھا، باہر کنواں تھا ——— مولوی صاحب ناک پر ہاتھ رکھے محرابِ مسجد سے نکل کھڑے ہوئے ——— سب دیہاتی ان کے پیچھے پیچھے، مسجد کے باہر جو نکلے تو ٹھوکر کھا کر گر پڑے، ان کی پیروی میں سب کو گرنا پڑا، سب کے چوٹیں آئیں لیکن ان دیہاتیوں نے یہیں بس کی اور یک زبان ہو کر بولے "مولوی صاحب یہ نماز تم کو مبارک ہو" یہ کہہ کر یہ جا وہ جا ———

اللہ اللہ یہ دیہاتی ہم سے زیادہ دانا و بینا نکلے، ٹھوکر کھا کر سنبھل گئے ———

ہمارا عالم یہ ہے کہ ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور سنبھلنے کا نام نہیں ——— بلکہ ہر ٹھوکر پر ٹھکانے والے سے بزبانِ حال یہ کہہ رہے ہیں ؎

سینہ اس کا ہے، دل اس کا ہے جگر اس کا ہے
تیرِ بیداد جدھر رخ کرے گھر اس کا ہے

ہاں تو ذکر تھا کالج کی دو رنگی کا ——— اس کی غیر نصابی سرگرمیوں کا ——— ذرا آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

ابتدا ہوتی ہے تیرے نام سے ——— حلف اٹھایا گیا، ہر ایک رکن نے اٹھایا اور اس سنجیدگی و متانت اور خلوص و دیانت سے اٹھایا کہ بس دیکھا کیجئے! ——— خدا کو گواہ بنایا گیا اور پھر کام وہ کئے گئے جن سے شیطان خوش ہو جائے، سبحان اللہ! ماشاء اللہ! ——— پہلے مشاعرے، مباحثے، مذاکرے وغیرہ ہوتے تھے، اب بھی ہوتے ہیں مگر کم کم ——— لطف نہیں آتا، مذاقِ زمانہ بدل گیا، ڈرامہ اچھا لگتا ہے، رقص و سرود کی محفل اچھی معلوم ہوتی ہے اور اگر مغنیہ ہو تو کیا کہنا!

اور ذرا تقسیمِ انعامات کی تقریب کی طرف آئیے ——— یہاں دیکھئے کیا ہو رہا ہے' وہی جو اوپر سے چلا آ رہا ہے ——— ایک موٹا رسّا لایا جاتا ہے، اِدھر استاد' اُدھر شاگرد' سیٹی بجا کر دونوں کو کھینچا تانی میں مصروف کر دیا جاتا ہے ——— کبھی استادوں کی رعایت کرکے طلبہ خود گھسٹ جاتے ہیں اور کبھی استادوں کو گھسیٹ لے جاتے ہیں، یہ منظر دیدنی ہوتا ہے ——— استادوں کی دوڑ کرائی جاتی ہے ——— لیکن آج کل جامہ تنگ میں دوڑنا وبالِ جان ہے ——— ایک مرتبہ ایک حادثہ پیش آیا، بس کیا عرض کروں، ناگفتنی ہے، غالب کا شعر سن لیجئے ؎

تھی بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

استادوں کے بعد طلبہ کا نمبر آتا ہے، بوریاں چڑھا چڑھا کر پھدکایا جاتا ہے، دو رگدھوں پر بٹھا بٹھا کر بھگایا جاتا ہے، عجیب عجیب لباس پہنا کر مسخرہ پن سکھایا جاتا ہے اور یہ مسخرے جب نکلتے ہیں تو پہلی صف کے مہمانوں کے لیے شامتِ اعمال بن جاتے ہیں ـــــ معزز مہمانوں کو بھی فارغ نہیں رکھا جاتا، ان کی ضیافتِ طبع کا سامان بہم پہنچایا جاتا ہے، باجا بجایا جاتا ہے اور کرسیوں پر بٹھا کر نچوایا جاتا ہے، کبھی چمچے منہ میں دبوا کر اور ان پر آلو رکھ کر خراماں خراماں چلایا جاتا ہے، جو صحیح سلامت منزل تک پہنچ گیا جیت گیا جس کا آلو گر گیا، نامراد ہوا ـــــ ایک اور رسمِ ستم ایجاد کی، معزز مہمانوں کو جمع کر کے بیچ میں ایک مرغا چھوڑ گیا اور اعلان کر دیا گیا کہ

ع جو بڑھ کر ہاتھ میں لے لے مُرغا اُسی کا ہے

مرغا چھوڑنا تھا کہ سب مہمان لپک پڑے، جس کے ہاتھ میں لگ گیا، مرغ لیے ہاتھ فضا میں لہرائے اپنی سیٹ پر جا بیٹھا ـــــ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

اللہ اللہ ہمارے علمی اداروں میں کیا کچھ ہوتا ہے ـــــ یہ تماشا دیکھنے والے اور تماشا کرنے والے ہر جگہ نظر آتے ہیں، عیدِ میلاد النبی کی محفلیں ہوں یا مقابلۂ حسنِ قرارت کی مجلسیں، ڈرامے ہوں یا رقص و سرود کی محفلیں ـــــ آخر یہ تماشا کیا ہے! یہ دو رنگی کیسی ہے! میں دین کی بات نہیں کرتا کہ "ملا" کہہ کر چھٹکارا حاصل کر لیا جائے گا ـــــ میں عقل و شعور کی بات کرتا ہوں، اس دو رنگی نے ہمارے تعلیمی ماحول اور ہمارے طلباء کے کردار کو بے حد متاثر کیا ہے ـــــ یقین نہ آئے تو غریب عربی مدارس کے طلبار کو دیکھ لیجئے، وہاں کا ماحول یکسر بدلا ہوا نظر آئے گا، آخر کیوں؟ ـــــ ٹھنڈے دل سے جائزہ لیجئے اور سوچنے کی ضرورت ہے ـــــ تقلید کا وقت گیا، اجتہاد کی ضرورت ہے، کم از کم اتنا ہی سوچ لیں جتنا ان مکو کر کھانے والے دہقانوں نے سوچا تھا اور مولوی صاحب سے بہت جلد چھٹکارا حاصل کر لیا تھا۔

کون کہتا ہے کہ غیر نصابی سرگرمیاں نہ ہونی چاہئیں، ضرور ہونی چاہئیں لیکن اس طرح

نہیں کہ نصاب سے یکسر بیگانہ کر دیں اور علم و دانش سے نفرت پیدا کر دیں۔

اب یہ حال ہو گیا ہے کہ بعض اداروں میں کتابیں الماریوں کی زینت بنی ہیں اور کوئی دیکھنے والا نہیں ——— بس نوٹس لکھوا دیجئے، کتابوں سے نجات دلوائیے۔

عبرت کے لئے ایک واقعہ بیان کرتا ہوں ——— ایک بڑے ادارے میں جہاں ایم۔ اے کی کلاسیں ہوتی تھیں، ایک خطیر رقم کی کتابیں منگائی گئیں ——— طلبہ نے پرنسپل سے شکایت کی کہ کتابیں کیوں منگائیں، ہم کو دیتے، کھاتے پیتے (اور شاید دعا بھی دیتے) عیش کرتے، کتابیں تو الماریوں میں بند ہو کر رہ جائیں گی، کوئی حاصل نہ حصول ——— حیف صد حیف، دورنگی کے شکار ہو کر ہم نے اپنے بچوں کے فکر و خیال پر کیسا شبخون مارا ہے ؎

آنچہ ما کردیم بر خود ہیچ نا بینا نہ کرد

آؤ آؤ کہ یک رنگی اختیار کریں ؎

یک رنگی و آزادی، اے ہمت مردانہ

تکاثر و تفاخر

انسان کے سر میں ایک سودا ہے، وہ ہر وقت دنیا سمیٹتا پھرتا ہے، مردوں سے زیادہ عورتوں میں یہ 'سوداویت' زیادہ ہے ———

یہ بھی لے لوں، بس چلے تو ساری دنیا سمیٹ لوں اور پھر بھی بس نہ کروں، اللہ اللہ ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟

لیکن سمیٹنے والے قضائے الٰہی کے ہاتھوں آن کی آن میں سمیٹ دیئے جاتے ہیں ———

کیسی عبرت کا مقام ہے! یہ خواہش انسان کو کہیں کا نہیں رکھتی، خود غرض بنا دیتی ہے، بے حس بنا دیتی ہے، خدا کو بھلا دیتی ہے اور پھر انسانیت کی بلندیوں سے حیوانیت کی پستیوں میں پھینک دیتی ہے ——— قرآنِ کریم نے انسان خواہش پرستوں سے کس دل سوزی کے ساتھ خطاب

فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے :-

"(افسوس) کثرت کی خواہش نے تم کو ہم سے غافل کر دیا، یہاں تک کہ تم نے اپنی آنکھوں سے اپنی قبروں کو دیکھ لیا"

انسان ایسا خواہش پرست ہو جاتا ہے کہ زندگی بھر خدا کی یاد نہیں آتی ——— اللہ اللہ نعمتوں پر نعمتیں ملتی ہیں، منعم یاد نہیں آتا ——— فراموشی سی فراموشی ہے ——— ہاں ہوش آتا ہے تو اس وقت جب موت کے سائے سر پر منڈلانے لگتے ہیں اور قبر منہ پھاڑے کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے ——— افسوس صد افسوس!!

آغوشِ لحد میں جب کہ سونا ہوگا
جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ! کون ہوگا انیس
ہم ہوں گے اور قبر کا کونا ہوگا

یہی نہیں کہ خواہش پرست صرف دنیا سمیٹتے ہیں بلکہ اس کثرتِ موہوم پر اتراتے پھرتے ہیں ——— ان کے بولنے چالنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے، رہنے سہنے غرض ہر ادا سے نخوت ٹپکتی ہے ——— قیمتی قیمتی لباس پہ غرور، اونچی اونچی عمارتوں پر غرور، لمبی لمبی کاروں پر غرور، دولت کی فراوانی پر غرور ——— یہ غرور و تکبر خود فریبی کے سوا اور کیا ہے؟ ——— ان میں سے کیا چیز ان کے ساتھ جائے گی؟ ——— صرف ان کے اعمال ان کے ساتھ جائیں گے اور اعمال کے متعلق اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سرخرو ہوگا اور کون روسیاہ؟

یہ خواہش پرست بڑے نازک مزاج ہوتے ہیں ——— بات بات پر بگڑتے ہیں، بات بات پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں ——— غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھنا ان کے لئے باعثِ عار ہے، بلکہ اپنے سے کم تر لوگوں کے ساتھ بھی میل جول نہیں رکھتے،

ان کا میل جول انہیں کے ساتھ ہوتا ہے جن کی زندگیاں عبرت بفضہ والی ہیں ——— خود جب یہ دنیا سے جاتے ہیں تو اہلِ دنیا کے لئے عبرت بن جاتے ہیں، کوئی پوچھنے والا نہیں ——— جس اندوختہ پر ناز تھا، اس پر پس ماندگان اس طرح لڑتے جھگڑتے ہیں گویا ایک عرصے سے اس کی موت کے منتظر تھے۔

افسوس ایسے روح فرسا منظر آئے دن ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں، پھر بھی ہم جمع کئے جاتے ہیں ——— آنکھیں نہیں کھلتیں، تکاثر و تفاخر کی عادت نہیں جاتی، یہ عادت معاشرہ کا گھن ہے جو اندر ہی اندر اس کو کھا جاتی ہے اور بے جان کر کے موت کے ہم آغوش کر دیتی ہے ——— حقیقی خوشحالی کے لئے یہ عادت چھوڑنا ہوگی اور اپنی زندگی اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے وقف کرنا ہوگی ؎

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

آمد و آورد

غالب نے کہا تھا ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غیب سے مضامین کا وارد ہونا ہی 'آمد' ہے، اور یہ آمد معنی بھی ہوتی ہے اور لفظاً بھی ——— یاد آیا ایک انگریز فاضل نے اقبال سے سوال کیا کہ "قرآنِ کریم معنی نازل ہوا ہے یا لفظاً بھی! ——— آپ نے جواب دیا "معنی بھی اور لفظاً بھی" ——— اس جواب نے انگریز کو کچھ چونکا دیا ——— اس نے کہا تعجب ہے، آپ جیسا روشن خیال انسان یہ بات کہتا ہے" ——— اقبال کو جلال آگیا اور انہوں نے فرمایا "آپ قرآنِ کریم کی بات کرتے ہیں، خود اپنی کیفیت بیان کرتا ہوں کہ جب مثنوی اسرارِ خودی لکھنے بیٹھتا ہوں تو لکھتا چلا جاتا ہوں ——— آمد بند

ہو جاتی ہے تو مدتوں منتظر رہتا ہوں، اس عرصے میں اگر میں چاہوں کہ کسی شعر کی اصلاح کر دوں نہیں کر سکتا، تاوقتیکہ پھر وہی کیفیت نہ طاری ہو۔" ——— غالباً اسی تجربے کی بنا پر اقبال نے کہا تھا ؎

ارتباطِ حرف و معنیٰ، اختلاطِ جان و تن

لفظِ 'آمد' جتنا شعر کے لئے صحیح ہے اتنا ہی ایک نثر پارے کے لئے بھی صحیح ہے لیکن بالعموم اس کا ذکر شعر و شاعری کے ضمن میں کیا جاتا ہے ——— سوچتے سوچتے دماغ چل نکلتا ہے، بند سوتے پھوٹ پڑتے ہیں اور ایک تلاطم کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، پھر یہ تلاطم شاعر کے ذہن سے ایک حسین شعر کا روپ دھار کر جلوہ گر ہوتا ہے اور ایک نثر نگار کے دماغ سے دل کش نثر پارہ بن کر چھلکتا ہے۔

طالب علمی کے زمانے میں ولیم ہیزلٹ کا ایک مضمون پڑھا تھا ——— اس نے لکھا تھا کہ خیالات اس سرعت سے ذہن پر وارد ہوتے ہیں کہ سنبھالے نہیں سنبھلتے، قلم سنبھالتا ہوں تو نکلے چلے جاتے ہیں، چند گرفت میں آجاتے ہیں مگر کچھ نکل بھاگتے ہیں اور پھر ہاتھ نہیں آتے ——— اس وقت یہ تحریر پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ہمارا یہ حال ہے ایک موضوع پر ایک دو صفحے لکھنے دو بھر ہیں اور اس کا حال یہ ہے کہ خیالات امنڈے پڑ رہے ہیں، آخر یہ آ کہاں سے رہے ہیں؟ ——— عقدہ نہ کھل سکا، بعض عقدے اتنی آسانی سے نہیں کھل جاتے، ان کے لئے بڑے ریاض کی ضرورت ہوتی ہے ——— زمانہ گزرتا گیا، پچیس سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد اب بات کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی ہے ——— خیالات قلب و دماغ پر وارد ہوتے ہیں ——— چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے حتیٰ کہ عبادت و ریاضت کے وقت بھی یہ فیضانِ غیبی جاری رہتا ہے ——— بغیر سوچے سمجھے میں آنے والی یہ کیفیت بڑے ریاض کے بعد پیدا ہوتی ہے ——— اس کے لئے مطالعہ و مشاہدہ، تفکر و تعمق اور کسی انسانِ کامل کی صحبت ضروری ہے ——— ان

سب باتوں کے باوجود یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ کیفیت عطائے ربانی ہے ـــــ خدا کی دین ہے جسے پروردگار دے۔

سخن فہمی و سخن سنجی

بلندیوں کی باتیں پستیوں میں سمجھ نہیں آسکتیں ـــــ نہ معلوم کیا وقت ہوتا ہے، کیا کیفیت ہوتی ہے، فکر و خیال کی کیا رفعت ہوتی ہے، جو ایک شعر یا ایک نثر پارہ قلب پر وارد ہوتا ہے ـــــ پھر وہ شعر اور نثر پارہ ہمارے سامنے ہوتا ہے لیکن نہ وہ وقت ہوتا ہے، نہ وہ کیفیت ہوتی ہے، فکر و خیال کی نہ وہ رفعت ہوتی ہے اور ہم ہیں کہ سمجھنے اور سمجھانے کی سعیِ لاحاصل میں معروف ہو جاتے ہیں! ـــــ کچھ سمجھتے ہیں اور کچھ سمجھاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ سب کو سمجھا دیا حالانکہ سچ پوچھو تو کچھ نہ سمجھا پائے ـــــ سخن فہمی کے لیے فضائے سخن میں پرواز ضروری ہے ـــــ یہ بات میسر نہیں تو کم از کم اس بلندی تک پہنچ جائیں جہاں سے فضائے سخن کو خود محسوس کر سکیں، غالباً اسی لئے اقبال نے یہ بات کہی ـــــ تجربے کی بنا پر کہی اور خوب کہی ؎

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

قرآن فہمی کے لئے ضروری ہے کہ تم قرآن کے اتنے قریب ہو جاؤ کہ یوں محسوس ہو کہ جبریل امیں کتابِ مبیں تمہارے قلب و روح پر اتار رہے ہیں ـــــ اگر یہ کیفیت پیدا نہیں اور یہ بات میسر نہیں تو امام رازی کی تفسیر کبیر اور علامہ زمخشری کی تفسیر کشاف کسی معرف کی نہیں ـــــ کتابوں سے کتابیں سمجھ میں نہیں آتیں، اور پھر ایسی کتاب، عالم میں جس کی نظیر نہیں۔

اقبال نے بڑی گہری بات کہہ دی ہے، بیشک جب تک خود باختگی اور خود فراموشی کی یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی، قرآن کے اسرار و معارف سمجھنا مشکل ہیں، اسی لئے قرآن نے قرآن فہموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

"جب ان کے سامنے قرآنی آیات پڑھی جاتی ہیں تو بے ساختہ ان کی

آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔" (۵ : ۸۳)

جب انسان قرآنِ کریم کی فضائے بسیط میں پہنچتا ہے تو اپنے ہوش میں نہیں رہتا، مدہوش سا ہو جاتا ہے ——— یوں پڑھنے کو سبھی پڑھتے ہیں ——— نمازوں میں، تراویح میں، شبینوں میں، مقابلہ حسنِ قرات میں ——— کہاں کہاں نہیں پڑھتے اور نہیں سنتے مگر سمجھنے والے اور دل دینے والے کتنے ہیں!

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی ——— اب شعر و سخن کی دنیا میں آیئے۔

بعض اوقات شعر کیا سامنے آتا ہے، ایک بجلی سی کوند جاتی ہے ——— عالمِ خیال میں جو گزری ہے، عالمِ ظاہر میں کیا بیان کیجئے، کس طرح بیان کیجئے اور کس کے سامنے بیان کیجئے کہ محرمِ راز نہیں ——— یہ کیفیت جب کلاس روم میں پیدا ہوتی ہے تو عجب الجھن ہوتی ہے، نابالغوں سے کیا کہیئے ——— شائد لفظ 'نابالغ' نے آپ کو چونکا دیا ہوگا ——— سنیئے جس طرح جسمانی بلوغ ایک حقیقت ہے، اسی طرح فکری بلوغ بھی ایک حقیقت ہے، جسمانی بلوغ کے بعد کی کیفیات و واردات کو ایک نابالغ کے سامنے بیان کرنا قطعاً ناممکن ہے ——— اسی طرح فکری بلوغ کے بعد جو کیفیات و واردات پیش آتی ہیں ان کا بیان کرنا بھی اس شخص کے سامنے تقریباً ناممکن ہے، جو فکری بلوغ تک نہیں پہنچا اور اس کے لئے کسی عمر کی قید نہیں، بوڑھے بالغ نہیں ہوتے اور کبھی نوعمر بالغ ہو جاتے ہیں اور ان کی فکر رسا کی جولانیاں، بوڑھوں کو حیرت میں ڈال دیتی ہے ——— سخن فہمی کے لئے ضروری ہے کہ پڑھانے والا اور پڑھنے والا دونوں اس فکری رفعت تک جا پہنچیں جہاں شاعر یا ناثر پرواز کر رہا ہے یا کم از کم اس رفعت کو چھو لیں ورنہ عجیب عجیب گل کھلتے ہیں ——— ایک لطیفہ یاد آیا آپ بھی سنیئے۔

غالب کے اس شعر کا مفہوم کسی فاضل سے دریافت کیا گیا ؎

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ارشاد فرمایا ـــــــ شاعر کہتا ہے کہ ہماری آہِ شعلہ بار ایک عرصے بعد اپنا اثر دکھائے گی، پھر اسے محبوب! تیری زلفِ گرہ گیر مل کر خاکستر ہو جائے گی اور چند یا نکل آئے گی (ملاحظہ ہو: زلف کے سر ہونے کی کیسی بلیغ تشریح فرمائی ہے) مگر یہ عبرت ناک منظر دیکھنے کے لئے ہم کہاں ہوں گے، ہم تو مر چکے ہوں گے، کاش ہم جیتے رہتے اور اپنی آنکھوں سے حسنِ جاناں کی یہ درگت بنتی دیکھتے!

حضرت شارح فضائے شعر میں نہ پہنچ سکے اور اس پر مستزاد یہ کہ التباسِ لفظی کا شکار ہو گئے۔ تحقیق کی اس لئے ضرورت پیش نہ آئی کہ اس ترقی یافتہ دور میں ناک کان کاٹ لینا اور چوٹی اتار دینا ایک ادنیٰ کرشمۂ عاشقی ہے ـــــــ غرض کہنا یہ ہے کہ جب تک شارح شعر کی فضائے بسیط میں نہ پہنچے تشریح بہت مشکل ہے اور شائقین کو یہ پڑھ کر حیرت ہو کہ بعض اوقات شاعر کی رفعتِ تخیل خود اس کی پہنچ سے بالاتر ہوتی ہے ـــــــ مرزا غالب کے خطوط پڑھ رہا تھا، ایک خط میں ایک ایرانی مہمان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس نے میرے اشعار میں وہ وہ نکتے بیان کئے ہیں کہ میں خود حیران ہوں، ان کا تو مجھے علم تک نہ تھا ـــــــ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات شاعر پر کچھ اس قسم کی کیفیت طاری ہوتی ہے ؎

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

بلکہ انتظار کرنا تو خود ہوش کی خبر دیتا ہے، عالم یہ ہوتا ہے ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ایسے نازک موقعوں پر خود سخن فہم و سخن سنج کو ان مقامات کی تلاش کرنا ہوتی ہے جہاں شاعر کھو گیا تھا اور ایسا کھو یا گیا تھا کہ اپنے کھونے کی خبر بھی نہ تھی۔

مسند نشینی یا بت پرستی

بت پرست نہ سہی مگر تحت الشعور میں بت پرستی کی آرزو کروٹ لیتی معلوم ہوتی ہے ——— اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ نہ ہوتا ——— مجلس سجی ہے، اسٹیج پر شاندار کرسی رکھی ہے، اس پاس دو تین اور کرسیاں رکھی ہیں، سامنے سامعین کے لئے انتظام ہے، آگے بڑے بڑے (یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ بڑا کون ہے) اور پیچھے چھوٹے چھوٹے (اور یہ بھی خدا ہی کو معلوم ہے کہ چھوٹا کون ہے) ——— مجلس کیا ہے، تذلیلِ انسانیت کی مظہرِ اتم ہے لیکن چونکہ ہوتا چلا آیا ہے اس لئے ہوتا رہے گا۔

ہاں تو اس شاندار کرسی پر کسی ممتاز شخصیت کو بٹھایا جاتا ہے ——— اور یہ لفظ 'ممتاز' بھی تحاضانی ہے، کون کہاں ممتاز؟ ——— ہار ڈالے جاتے ہیں، سپاسنامے پڑھے جاتے ہیں ——— اور اگر کوئی سخی داتا ہے تو سپاسنامے کے پردے میں بھیک مانگی جاتی ہے ——— زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں اور نہ معلوم وہ بت بنے کیسے سب کچھ سنتے رہتے ہیں اور غالباً محظوظ بھی ہوتے ہیں ——— حاضرین سے زیادہ منتظمین کی حالت ہوتی ہے "باادب باملاحظہ ہوشیار!" ——— مجلس ختم ہوئی اور یہ تماشا ختم ہوا، پھر خبر نہیں وہ کہاں گئے ——— دوسری محفل سجتی ہے اور کچھ ان سے اونچی شخصیت کو بلایا جاتا ہے، وہی در و دیوار ہیں مگر یہاں ان کو پہچاننے والا کوئی نہیں جن کو پہلے پوچھا جا چکا تھا ——— اب ان کی باری ہے، وہی گنٹھے، وہی سپاسنامے، وہی خوشامد درآمد ——— یہ بھی چلے جاتے ہیں، تیسری مجلس سجتی ہے تو ان سے بھی اونچی شخصیت کو دعوت دی جاتی ہے، اب دونوں پچھلی شخصیتیں بے یار و مددگار نظر آتی ہیں، وہی منتظمین، وہی سامعین مگر نظریں بدلی بدلی سی ——— غرض سب آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، ہر ایک کے پیچھے دوڑتے ہیں، دست بوسی و قدم بوسی کے بعد لوٹ جاتے ہیں ——— یہ حیرتناک منظر دیکھ دیکھ کر غالب کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آتا ہے ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

یہ ان محفلوں کا ذکر تھا جہاں بت پرستی کی رسم دیرینہ تازہ کی جاتی ہے ——— مگر دیکھو دیکھو مدینہ کی پاک سرزمین میں ایک مجلس جمی ہے سب فرشِ خاک پہ بیٹھے ہیں، آقا اور غلام ساتھ ساتھ ہیں، سند نام کی کوئی شے نہیں لیکن آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رعب و جلال کا یہ عالم ہے کہ غلاموں کے سر اس طرح جھکے ہیں کہ اب نہ اٹھیں گے ——— کسی نے نہیں جھکائے خود بخود جھکے ہیں، جگر نے کیا خوب کہا ہے ؎

ظاہر میں غریب الغربا، پھر بھی یہ عالم
شاہوں سے سوا سطوتِ سلطانِ مدینہ

آؤ آؤ! ہم بھی ایسی مجلسیں سجائیں جہاں انسانوں کے ہاتھوں انسان ذلیل و خوار نہ ہوں ——— جہاں جھوٹے نگینوں کی ریزہ کاری نہ ہو ——— جہاں سچے اور جیتے جاگتے کردار نظر آئیں ——— جن کی شان و شوکت نہ جلسہ گاہ کی سج دھج کی مرہونِ منت ہو اور نہ حاضرین کے نعرہ ہائے تحسین کی ——— فرشِ خاک پر بیٹھیں تو ان کے چہرے سے جلالِ شاہی نمایاں ہو۔

زمانہ

پرانا زمانہ، نیا زمانہ ——— لوگ کہتے تو یہی ہیں لیکن کیا ایسا ہوتا بھی ہے؟ کیا زمانہ قابلِ تقسیم حقیقت ہے؟ ——— کیا زمانہ بچپن آتا ہے؟ ——— کیا وہ جوان ہوتا ہے؟ ——— کیا وہ بوڑھا ہوتا ہے؟ ——— نہیں نہیں ؎

زمانہ ایک حیات، ایک کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم

زمانہ ایک حقیقت ہے ——— زمانہ مقلب القلوب اور مبدل الاحوال ہے ——— دیکھو دیکھو، محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی وہ خود بول رہا ہے:

لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَإِنِّي أَنَا الدَّهْرُ

"زمانے کو برا نہ کہو، ہاں ہاں زمانہ تو میں ہی ہوں"

میں کون ؟ ——— وہی جو باعثِ رونقِ محفل ہے، وہی جو جاں ہے، وہی جو جانِ جاں ہے

نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (۵۰:۱۶)

حیدر آباد دکن کا ایک انجینئر حقیقتِ زمان پر غور کرتے کرتے کھو گیا، حواس باختہ ہو گیا ——— ستائیس سال ہوتے ہیں وہ دہلی کی شاہجہانی مسجد فتح پوری کی ایک محراب میں بیٹھا قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ پڑھا کرتا تھا، پکھتال کا ترجمہ ——— فقیرانہ بسر کرتا تھا، شب و روز کے اوقات بندھے ہوئے تھے، وقت کا بہت پابند تھا حتیٰ کہ مانگنے کا وقت بھی بندھا ہوا تھا ...... طریقہ بھی نرالا تھا، دکان کے سامنے کھڑے ہوئے کشکول آگے بڑھا دیا، منہ سے کچھ نہ کہا، تھوڑی دیر کے بعد ہاتھ کھینچ لیا، خواہ کسی نے کچھ دیا یا نہ دیا، اپنے وقت پر مسجد میں آکر بیٹھ جاتے اور دوسرے معمولات میں مصروف ہو گئے، خود ہی ہنستے، روتے بھی تھے، خاموش رہتے، کسی سے نہ بولتے ——— ایک دن حوصلہ کر کے میں نے بولنا چاہا، انہوں نے کچھ جواب نہ دیا ——— وہ جن افکار میں کھوئے ہوئے تھے ایک ایک کر کے سامنے آنے لگے ——— تھوڑی دیر بعد خود گویا ہوئے :

"میں نے بہت پڑھا ہے، ہاں میں نے بہت مطالعہ کیا ہے، جو کچھ پڑھا ہے اب اس کو سمیٹ نہیں پاتا، ذہن الجھ گیا ہے، فکر نے جواب دے دیا ہے، کیا کروں کیا نہ کروں ؟"

کچھ توقف کیا، پھر بولے :

"قدرت کا ہر کام اصول و آئین کے تحت، اپنے اپنے وقت پر ہوتا ہے ——— جاڑا وقت پر آتا ہے، گرمی وقت پر آتی ہے، ترکاریاں اور پھل بھی اپنے اپنے وقت پر نکلتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ جاڑے کی ترکاریاں گرمیوں میں اگنے لگیں ——— چند سال پہلے جب رمضان آیا تھا تو نہ یہ پھل تھے، اور نہ یہ ترکاریاں، اب جو آیا ہے تو سب موجود ہیں، کیا یہ وہی رمضان ہے ؟ ——— اگر وہی ہے

تو پھر یہ تضاد کیوں؟ ——

وہ سوال پر سوال کرتا چلا گیا، میں سنتا رہا —— اس ملاقات کے بعد پھر ملاقات کی جرأت نہ ہوئی کہ کہیں خود نہ اُلجھ جاؤں اور پھر کوئی سلجھا نہ سکے —— اسی لئے تو کہتے ہیں کہ اُلجھے ہوئے لوگوں کے پاس نہ بیٹھو، سلجھے ہوئے لوگوں کے پاس بیٹھو ؎

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا

ہاں تو ذکر تھا زمانے کا، وہی زمانہ ؎

بآں صفت تیغ دو پیکر نظر اس کی

جس طرح خدا کی حقیقت پر غور کرتے کرتے انسان کھو سا جاتا ہے، اسی طرح حقیقتِ زمان پر غور کرنے سے انسان گم سم ہو جاتا ہے —— کیوں؟ اس لئے کہ خدا اور زمانہ دو الگ حقیقتیں نہیں مگر اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے بڑے حوصلے اور بڑی بصیرت کی ضرورت ہے، اسی لئے تو کہا ہے:

"خدا کی ہستی میں غور و فکر نہ کرو —— ہاں خدا کی نشانیوں میں ضرور غور و فکر کرو۔"

اور دیکھئے ایک لطیف نکتہ سامنے آیا —— قرآنِ کریم خدا نے نازل کیا ہے نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ، اور جو قانون خود زمانے نے نازل و نافذ کیا ہو وہ پرانا نہیں ہو سکتا، فنا اسی کو ہے جس پر زمانہ محیط ہے كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ، وہ حی و قیوم ہے، وہ زندہ و پائندہ ہے —— اس کا قانون بھی زندہ و پائندہ ہے

رحمت و غفلت | اس کی طرف سے رحمت ہی رحمت ہے كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ —— اور ہماری طرف سے غفلت ہی غفلت ہے قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ —— ماحول پر نظر ڈالیئے، اپنے اردگرد دیکھئے، رحمتوں اور نعمتوں کے انبار کے انبار لگے

ہیں ـــــ کس کس نعمت کو گنایا جائے! وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا ـ

کیا بتاؤں کہ کیا لیا میں نے
کیا کہوں میں کہ کیا دیا تو نے

سب سے بڑی نعمت اور سب سے عظیم رحمت خود ہمارا وجود ہے۔ اسی ایک نعمت پر تمام نعمتیں مرتب ہوتی ہیں ـــــ لیکن انسان کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ جو رب العالمین دن رات کھلاتا ہے ـــــ جو ارحم الراحمین راتوں کو سلاتا اور دن کو اسباب معیشت فراہم کرتا ہے، اسی کو اس طرح بھلا دیا ہے کہ جیسے کوئی تعلق ہی نہیں ـــــ ناشکری اور ناسپاسی کی حد ہے ؎

آنچہ ما کردیم بر خود ہیچ نابینا نہ کرد

شاید ہم نے یہ سمجھا ہے کہ ہماری کوششوں سے ہم کو ثمرات ملتے ہیں ـــــ مگر ہمارا ہے کیا! سب کچھ تو اسی کا ہے ؎

ہیچم اگر تو باز ستانی متاع خویش
وارد دو عالم از تو قلیل و کثیر را

اور پھر کوشش کی حد تک تو ہم مختار نظر آتے ہیں مگر نتائج و ثمرات میں ہم بے اختیار ہیں، اس پر ہم قدرت نہیں رکھتے مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ـــــ ان نتائج پر اس کو اختیار ہے۔ اس کو اختیار نہ ہوتا تو پھر ایک ہی قسم کی کوشش کے مختلف ثمرات و نتائج نہ ہوتے ـــــ اس اختلاف میں کبھی تو کوئی نسبت ہی نہیں ہوتی، زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے ـــــ آخر یہ نشیب و فراز کیوں ہے! ـــــ جب کوشش ایک سی ہے تو نتائج ایک سے کیوں نہیں؟ ـــــ یقیناً پردۂ غیب میں کوئی عظیم طاقت ہے جس کے اشاروں پر سب کچھ ہوتا ہے ـــــ ہاں اس کی رحمت ساتھ نہ دے تو کوئی کچھ کر نہیں کر سکتا ـــــ بہت سوں نے بھلا دیا اور غافل ہو گئے، ان کو غفلت کا مزا چکھا دیا گیا، مٹا دیا گیا ـــــ تاریخ عالم دیکھئے۔ غفلت و غفلت کی داستان کے علاوہ اس میں ہے کیا!

دن میں صرف پانچ وقت اپنے حضور بلایا جاتا ہے ——— یہ بلاوا معمولی بلاوا نہیں 'معراج المؤمنین' ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کی ٹھنڈک ہے، ذرا اس کی منزلت تو دیکھو ——— اس ملاقات کا مجموعی وقت ایک دو گھنٹے سے زیادہ نہ ہوگا اور پھر یہ سب ہمارے ہی لئے ہے، وہ تو بے نیاز ہے، وہ ہماری بندگی کا محتاج نہیں، وہ ہماری محبت کا بھوکا نہیں ——— یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی جی چراتے ہیں، ۲۴ گھنٹوں میں سے دو گھنٹے اس کے لئے گراں معلوم ہوتے ہیں جس نے زندگی دی، جس نے انسان بنایا اور اپنی نعمتوں سے اس طرح نواز کر تمام کر دیا اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ ———

بائیس ۲۲ گھنٹوں پر ہمیں اختیار دیا گیا، صرف دو گھنٹے اپنی حضوری کے لئے مختص کر دیئے، اس جبر و اختیار میں کوئی بھی تو نسبت نہیں، کیسا کرم فرمایا! ——— جبر کہاں ہے، اختیار ہی اختیار ہے ——— یہ کیسی رحمت ہے! مگر آنکھیں پٹ ہو گئیں، کچھ سوجھتا نہیں، غافل ہو گئے ——— ہمارا حال اس سرکش غلام کا سا ہے جو آقا کے ٹکڑوں پر پلتا ہے اور آقا ہی کو آنکھیں دکھاتا ہے، حیف صد حیف!

اے ملت کے جوانو! ذرا غور تو کرو، تم کو کیا ہو گیا! تم کو کس کی نظر کھا گئی! تم تو ایسے نہ تھے ——— تم تو اس کے ایک اشارے پر سر دے دیا کرتے تھے، گھر لٹا دیا کرتے تھے، آج تم کو سر بھی عزیز ہے اور گھر بھی ——— دیکھو دیکھو! جب تک اس ارحم الراحمین اور اس رحمۃ للعالمین کو نہ چاہو گے، دنیا تمہیں نہ چاہے گی ——— اس کی رحمت پر نظر رکھو، غفلت سے باز آجاؤ، تاریخ پڑھو اور چاہت کا انجام دیکھو ——— دنیا نے کب ہمیں چاہا! ——— جب ہم نے اسے چاہا ؎

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

شادی و غم خوشی کیا ہے، غم کیا ہے، یہ دو رنگی کیسی ہے! —— یہ دل کشی کیا ہے، یہ وحشت کیوں ہے؟ ؎

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

ایک ہی بات ہے، ایک ہی ساز ہے، ایک ہی نغمہ ہے —— کسی کے لئے خوشی، کسی کے لئے غمی —— تعلق کی بات ہے، احساس کی بات ہے، اور دل کے ردِ عمل کی بات ہے۔

ہاں اس دو رنگی سے کس طرح چھٹکارا حاصل کریں، زندگی کیسے بسر کریں! —— خوشی کے طلبگار نہ رہو، الم خود بخود گریزاں ہوگا اور ایسا گریزاں ہوگا کہ کبھی پاس نہ پھٹکے گا —— تکمیلِ آرزو کا نام خوشی ہے، ناتمامی و ناکامی کا نام غم۔ —— دل کو آرزوؤں اور تمناؤں سے خالی کیوں نہ کر دیا جائے کہ غم سے پیچھا چھوٹ جائے اور خوشی و غم کی یہ دو رنگی ختم ہو جائے —— مگر اس کے لئے بڑے حوصلے کی ضرورت ہے، بڑی ہمت کی ضرورت ہے ؎

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یک دانہ
یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ

غالب نے خوشی و غم کے اس مسئلے کو خوب حل کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ خوشی کا خیال ہی چھوڑ دو، غم نہ لگے گا، تم دیکھتے نہیں موسمِ خزاں جبھی آتا ہے جب موسمِ بہار آتا ہے، بہار نہ آئے تو خزاں کاہے کو آئے! ؎

شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے
اردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

لیکن یہ ایک نفسیاتی حل تھا —— آیئے ذرا عارفانہ نظر پیدا کیجئے، جس کی غلامی کی ہے نگاہ اس پہ رکھئے اور دل کو اسی کے سپرد کر دیجئے ؎

دل تو جاتا ہے اس کے کوچے میں
جا مری جان جا، خدا حافظ

اس کی رضا میں ایسے گم ہو جائیے کہ اپنی کوئی خواہش نہ رہے، ہاں یہ مقام مقامِ طمانیت ہے، یہی وہ مقام ہے جو شادی و غم کی دورنگی سے بالاتر ہے ——— خوشی کو غم چھین لیتا ہے اور غم کو خوشی، مگر اس طمانیت کو کوئی نہیں چھین سکتا ؎

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا!

اہلِ رضا کی زندگی سے غم نکل گیا کہ وہ خوشی کے طلبگار نہیں، جو حق کا طلبگار ہو وہ غیرِ حق پر نظر نہیں رکھتا، خوشی بھی غیر ہے، عین نہیں ——— یاد آیا، ایک بزرگ کے حال میں لکھا ہے کہ ان کی کوئی قیمتی چیز کھو گئی، خادم نے اطلاع دی، کچھ نہ فرمایا ——— سر جھکایا، مراقب ہوئے ——— سر اٹھایا تو یہ فرمایا 'الحمدللہ'! ——— چند روز کے بعد وہ چیز مل گئی، خادم نے پھر اطلاع دی ——— کچھ نہ فرمایا، سر جھکایا، مراقب ہوئے اور سر اٹھایا تو وہی کلمہ شکر 'الحمدللہ'! ——— حاضرین متحیر ہو گئے۔

اتفاق سے اِس مجلس میں وہ لوگ موجود تھے جو اُس مجلس میں بیٹھے تھے ——— چپ رہا نہ گیا، ہمت کر کے ایک صاحب نے دریافت کیا کہ حضرت وہ چیز کھو گئی تو آپ نے فرمایا 'الحمدللہ' مل گئی تو پھر وہی کلمہ ارشاد فرمایا، آخر کیوں؟ اس میں کیا راز ہے! ——— بزرگ نے جو کچھ فرمایا، آبِ زر سے لکھنے کے قابل اور حرزِ جان بنانے کے لائق ہے، آپ نے فرمایا:

"جب وہ چیز کھوئی تو میں نے اپنے قلب کی طرف نگاہ کی کہ کہیں اس کے غم میں تو مبتلا نہیں، میں نے دیکھا کہ دل اسی طرح اپنے خدا کی طرف متوجہ تھا، ذرہ برابر غم نہ تھا، قلب کی اسی طمانیت و یک سوئی پر میں نے 'الحمدللہ' کہا ——— پھر جب وہ چیز مل گئی تو میں نے پھر دل پر نظر کی اور دیکھا کہ کہیں اس کی خوشی میں تو مگن نہیں لیکن دل اسی طرح اپنے خدا کی طرف متوجہ تھا، ذرہ برابر خوشی نہ تھی، میں نے اس کیفیت پر 'الحمدللہ' کہا۔"

دیکھا آپ نے! خدا کے محبوب و مقبول بندے خوشی و غم سے کیسے بے نیاز ہوا کرتے

ہیں ـــــ یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی لیکن اب سمجھ میں آگئی ہوگی ـــــ محبت کرنی ہو اور زندگی گزارنی ہو تو آدابِ محبت اور آدابِ زندگی ان سے سیکھئے جو دل دے کے دل کی کیسی پاسداری کرتے ہیں! ـــــ دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے دل کی لگی میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا ـــــ یہ بات اس وقت پیدا ہوتی ہے جب خوشی و غم سب محبوب کے قدموں پر نچھاور کر دیئے جائیں ـــــ اور ہاں جب یہ بات پیدا ہو جاتی ہے تو انسان خوشی و غم سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور محبت رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے تو پھر مصائب میں بھی لطف آنے لگتا ہے! پھر حقائق کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب آجاتا ہے ـــــ

مدہوشیوں سے کسی کو لطف اندوز ہوتے اور تلخیوں سے کسی کو شیریں دہن ہوتے نہ دیکھا گیا ہوگا اور نہ سنا ہوگا ـــــ لیکن ہاں عاشقانِ الٰہی کے ہاں یہ عجائبات نظر آتے ہیں ـــــ دیکھو دیکھو سرزمینِ ہند میں ایک مردِ کامل بیٹھا خدا کی یاد میں مصروف ہے ہاں وہی ہے

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار

ایک عالم سیراب ہو رہا ہے ـــــ تشنہ کاموں کا اژدحام ہے کہ میخانہ گرم نائو نوش ہے لیکن دشمنوں کو ساقی کی یہ ادائے دل نواز پسند نہ آئی. شاہِ وقت سے جا کر ایسی لگائی کہ وہ غضبناک ہو گیا، دربار میں طلب کیا اور پھر زنداں میں محبوس کیا لیکن واہ رے استقامت کہ اُف تک نہ کی اور اس تیرِ جفا میں وہ لطف اٹھائے کہ بس ہی بس ـــــ قلعۂ گوالیار میں پابزنجیر ہیں، دشمن نے گھر لوٹا، اہل و عیال کو دربدر کیا مگر وہ دشمن کی ہر ادا کو ادائے جاناں سمجھ کر لطف اندوز ہو رہا ہے ـــــ وہ نہ دشمن کو خود کچھ کہتا ہے اور نہ کسی کو کہنے دیتا ہے، فرقت کے مارے عزیزوں کو بھی ہدایت کرتا ہے کہ غم و الم سے لطف اندوز ہو! اگر تم کو خدا سے محبت ہے، اگر تم کو اس سے پیار ہے تو پھر اس کے ہر ہر عمل سے پیار ہونا چاہیئے

——— غموں کو بھی سینے سے لگانا چاہیئے کہ یہ بھی عطائے ربانی ہے ؎

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غمِ جاں بنا دیا

یہ کون عالی حوصلہ ہے جس نے بلاؤں میں لطف اٹھائے ہیں جو غمِ دوراں سے بے نیاز ہے جو صرف اور صرف اسی کا نیاز مند ہے جس سے نیاز مندی ہر در سے بے نیاز کر دیا کرتی ہے اور ہر کیف سے بے کیف کر دیا کرتی ہے ——— ہاں یہ سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کے آفتابِ درخشاں اور سلوک و عرفاں کے ماہتابِ رخشاں حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ ہیں ——— آؤ ان کے در سے یہ سبق سیکھو کہ شادی و غم سے کس طرح بے نیاز ہوا کرتے ہیں اور بے نیاز ہو کر کتنے بلند ہو جایا کرتے ہیں۔

احساس احساس صاحبِ کرامت ہے، احساس مظہرِ عجائب ہے ——— گرمی و سردی اور خوشی و غمی اسی ایک احساس کی کرامت ہے ——— ہشیار دل کو دیکھو مغموم و مسرور بھی ہوتے ہیں اور گرمی و سردی سے بھی متاثر ہوتے ہیں ——— لیکن مستوں کا حال عجیب ہے، احساس کی دولت ان سے چھین لی گئی، اب وہ گرمی و سردی اور خوشی و غمی سے بے پروا بلکہ ہر چیز سے بے نیاز، حتیٰ کہ لباس سے بے نیاز کڑکتے جاڑوں میں سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہیں جب کہ لوگ گھروں میں بیٹھے آگ تاپ رہے ہوتے ہیں ——— مین غم میں کھل کھلا کر ہنستے ہیں ——— کیا بات ہے؟ احساس نہیں، وہ مقناطیسی قوت نہیں جو خارج کو داخل میں لاتی اور فکر و شعور پر محیط ہو جاتی ہے۔

اسی احساس کی بدولت اَن ہونی چیزیں ہوتی معلوم ہوتی ہیں حالانکہ نہیں ہوتیں اور اسی احساس کی بدولت موجود چیزیں معدوم ہو جاتی ہیں اور معدوم چیزیں موجود ——— اندھیروں میں ڈر لگتا ہے، احساس کروٹ بدلتا ہے اور پھر دیکھئے کیا کیا نظر آتا ہے ——— جب اجالا ہوتا ہے سب صورتیں غائب ہو جاتی ہیں، کچھ بھی نظر نہیں آتا ——— یہ صورتیں ہاں یہ خیالی

صورتیں کہاں چلی گئیں! ———— احساس سے پوچھو! احساس کو جھنجھوڑ دو!

قرآن سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ جنات کا وجود ہے لیکن احساس نے سینکڑوں چیزوں کو جنم دیا ———— بھوت پریت، دیو پری، چڑیل، پوڑنا پوڑنی اور نہ معلوم کیا کیا کچھ! غالباً اسی لئے بعض فلاسفر یہ کہنے لگے کہ خارج میں کچھ نہیں سب اختراعِ ذہنی ہے لیکن نہیں کچھ تو ہے جو یہ تماشا ہے۔

احساس کی سچی کرامتیں بھی ہوتی ہیں اور جھوٹی بھی ———— جو لوگ اس کی جھوٹی کرامتوں کے قائل ہیں ان کے سامنے فکرِ انسانی جھوٹے بچے بہلانے بہلانے لگتی ہے ———— لوگ یہ بہانے قبول کرتے ہیں بعض پیسے بنانے کے لئے اور بعض فکر کی تنگ دامانی کی وجہ سے ———— احساس کی اس کج روی نے نہ معلوم کتنے خاندانوں کو خوشحال کر دیا (جیسے نام نہاد عامل) اور کتنے خاندانوں کو بدحال کر دیا اور ان کا سکون و چین لوٹ لیا (جیسے ضعیف الاعتقاد لوگ) ———— اسی احساس کی تعمیرِ نو کے لئے مذہبِ اسلام آیا اور ایک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا۔ اس کا سب سے بڑا احسان اور سب سے عظیم شاہکار یہی ہے کہ اس نے جینا سکھایا یعنی ہماری سوچ کی راہوں کو متعین کیا اور اسی طرح احساس کو پختہ تر کر کے ہم کو بھٹکنے سے بچایا ورنہ ہم دَر دَر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

مگر اس نے اپنا اَتا پَتا بتا کر احساس کی کج روی کو قابو میں رکھنا سکھایا ہے:

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْد

روباہی و شیری

لوگوں کو منصب و عہدہ کیا ملتا ہے، اکڑنا شروع کر دیتے ہیں ———— ایک صاحب دفتر میں اکڑتے تھے، گھر میں انکساری و عاجزی کے ساتھ ملتے! اور بہت سے ایسے باہمت ہیں جن کو یہ عاجزی بھی نصیب نہیں جن کی اکڑ صرف

موت ہی ختم کرتی ہے) ـــــــ ہاں تو جب ان سے پوچھا گیا کہ یہ دو رنگی کیسی؟ ـــــــ ارشاد فرمایا کہ دفتر میں افسر تھا اور یہاں ایک عام انسان ـــــــ سبحان اللہ! کیا کرسی پر بیٹھ کر ماہیت و حقیقت بدل جایا کرتی ہے! ـــــــ ذرا غور تو کرو کالی کملی والے آقا کی آقائی کیا کسی وقت ان سے علیحدہ ہو جایا کرتی تھی ـــــــ جہاں کہیں تشریف لے جاتے، منصب رسالت ساتھ ہوتا جو ہر جگہ، رسول رب کریم اور رحمۃ للعالمین تھے، افسروں کے افسر، آقاؤں کے آقا، ان کی پاک زندگی دو رنگی کا شکار نہ تھی، وہ ہر جگہ سر جھکائے چلتے اور ہر مجلس میں سر جھکائے بیٹھتے اور سب سے عاجزی و انکساری سے ملتے۔

ایک مغربی مفکر نے کہا ہے کہ کامیاب حاکم وہ ہے جو روباہی اور شیری دونوں میں طاق ہو ـــــــ خود پر جب وقت آپڑے تو روباہ بن جائے اور جب دوسرے پر وقت آپڑے تو شیر ہو جائے ـــــــ ماشاء اللہ، سبحان اللہ! حکمرانی کا کیا گر بتایا ہے ـــــــ کیسا نفاق کا بیج بویا ہے ـــــــ آج تک اس کے کڑوے پھل ہمارے نصیب میں لکھے ہیں ـــــــ اس سے بڑھ کر بزدلی اور منافقت کیا ہوگی ـــــــ افسوس صد افسوس! ہمارا پورا معاشرہ اس روباہی و شیری کا شکار ہے ـــــــ کاش مغرب کے اس چالاک و عیار مفکر سے آنکھیں پھیر کر مشرق کے اس آفتاب کی طرف نظر اٹھائی جاتی جس نے اہل عالم کی نگاہیں خیرہ کر دی تھیں جس نے جہانبانی کا گر بتایا، جس نے حکومت کی بنیاد محبت و اخوت پر استوار کی، جس نے صرف اور صرف خدا کے دشمنوں کے آگے اکڑنا سکھایا۔

لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ذرا سا منصب ملا خوشی سے پھولے نہیں سماتے، بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں اور کرسی پر بیٹھ کر ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ دیکھ دیکھ کر ہنسی آتی ہے اور اس تنگ ظرفی پر افسوس بھی ہوتا ہے، قابلِ رحم حالت معلوم ہوتی ہے، دل چاہتا ہے کہ اس غریب کی عیادت کی جائے اور پوچھا جائے۔

" بھائی ابھی تو تم اچھے خاصے تھے، یہ کیا ہو گیا! پیشانی پر بل کیوں ہیں ـــــــ سر میں درد

تو نہیں ؟ ـــــ منہ کیوں لبسورر ہے ہو ؟ ـــــ کیا پیٹ میں درد ہے ؟ ـــــ گرا کڑی ہوئی کیوں ہے ؟ ـــــ کیا چک آگئی ! ـــــ خراماں خراماں کیوں چل رہے ہو ؟ ـــــ کیا موچ آگئی ! ـــــ روٹھے روٹھے کیوں بیٹھے ہو ؟ ـــــ اہل خانہ سے لڑائی ہوگئی ! ـــــ بھائی کچھ تو بولو ! تم نے یہ چپ کیوں سادھ رکھی ہے ! ـــــ تم کو کس کی نظر کھا گئی ؟ "

اقتدار کا نشہ بہت بُرا ہوتا ہے ، قلب و نظر پر پردے پڑ جاتے ہیں ، دماغ ماؤف ہو جاتا ہے ، فکر کے سوتے بند ہو جاتے ہیں ، پھر کوئی سمجھائے بھی تو سمجھ میں نہیں آتا ـــــ مگر اہل ہمت ان پردوں کو چاک کر کے باہر نکل آتے ہیں اور جب کرسی پر بیٹھتے ہیں تو ان کے چہرے پر مسکراہٹیں کھیلتی ہیں ، وہ ضعیف کو قوی سے بچاتے ہیں ، وہ اسی وقت شیر ہوتے ہیں جب شریعت و انسانیت ان کو شیر بنانا چاہتی ہے ، وہ کسی حال میں روباہ نہیں بنتے ، انہوں نے روباہی سیکھی ہی نہیں ؎

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

وہ اپنا کام نکالنے کے لئے ایک ایک کی خوشامد نہیں کرتے اور جب کام نکل جاتا ہے تو پھر آنکھیں نہیں پھیرتے ـــــ وہ سب کا کام کرتے ہیں اور کسی سے کوئی غرض نہیں رکھتے ـــــ جب اپنے حاکم کے سامنے جاتے ہیں تو بے دھڑک جاتے ہیں ، وہی کہتے ہیں جو دل میں ہوتا ہے ـــــ ان کا دل زبان کا ساتھی اور زبان دل کی ساتھی ـــــ وہ ہر حال میں خدا پر نظر رکھتے ہیں اس لئے ان کا دل ہر وقت شیر رہتا ہے ۔

آزادی یا خود گرفتاری | انسان کو خدا نے فطرۃً آزاد پیدا کیا ہے لیکن نہ معلوم کیوں وہ آزاد فضاؤں سے زیادہ زنداں و قفس کو پسند کرتا ہے ـــــ گھروں میں بند ہو بیٹھنا ، مخلوقِ خدا بلکہ دوستوں اور رفیقوں کے لئے بھی دروازے بند کر لینا

کر کہیں شکست خوردہ سانڈ کے روندن میں آکر کچلے نہ جائیں، غرض ان کا وجود پریشان کن تھا۔
ایک روز میونسپل کمیٹی کے ٹرک آئے اور ایک سانڈ کو پکڑ کر ٹرک میں ڈال دیا ـــــــ یہ خاص قسم کے ٹرک تھے، چاروں طرف سے بند، پیچھے لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی ـــــ سانڈ کیا بند ہوا کہ ہر طرف سے لوگ امڈ آئے، دیکھتے ہی دیکھتے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے، جو ہے دوڑا چلا آرہا ہے ـــــــ پوچھا کیا ماجرا ہے؟ معلوم ہوا کہ سانڈ بند کر دیا گیا ـــــــ دیکھا آپ نے وہی سانڈ جو روزانہ سامنے چلتا پھرتا تھا، زندانِ ادب میں بند ہو کر کہاں سے کہاں پہنچ گیا ـــــــ قدر و قیمت کس قدر بڑھ گئی ـــــــ اس قدر گراں ہو گیا کہ اب دیکھے سے بھی نظر نہیں آتا۔

یہی حال ہمارے معاشرے کے ان لوگوں کا ہے جو گرفتار بلکہ خود گرفتار رہتے ہیں، شاید اس لئے کہ کچھ قدر و قیمت بڑھ جائے، یوں چلتے پھرتے ہیں مگر کمرے کے اندر گھستے ہی انداز بدل جاتے ہیں ع

عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا!

لیکن حقیقی قدر و قیمت خود گرفتاری سے نہیں بڑھا کرتی ـــــــ یہ خام خیالی ہے، قدر و قیمت آزادی سے بڑھتی ہے ـــــــ دیکھو دیکھو مدینہ میں ایک گدڑی پوش بیٹھا شاہی کر رہا ہے (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) وہ گورنروں کو بھیجتا ہے مگر ان سے عہد لیتا ہے:۔

"موٹا جھوٹا پہنو گے"

"ڈیوڑھی نہ بناؤ گے"

"دربان نہ بٹھاؤ گے کہ جو فریادی آئے سیدھا تمہارے ہی پاس آئے"

شاید دنیا کے کسی بادشاہ نے اپنے گورنروں سے یہ عہد نہ لیا ہوگا ـــــــ اور یہ صرف زبانی جمع خرچ نہ تھا، کر کے بھی دکھایا اور جب سنا گیا کہ ایک گورنر نے اس عہد کی خلاف ورزی کی ہے تو اس کو مدینہ طلب کر کے باز پرس کی گئی اور معطل کر دیا گیا ـــــــ کتنا

بڑا جرم تھا! ——— آج یہ جرم، جرم کی فہرست میں داخل ہی نہیں ——— ایک انارکلی کو روتے ہیں کہ اس کو در و دیوار میں چن دیا گیا، لیکن ہمارے معاشرے میں کتنے ہیں جو روز نہ چنے جاتے ہیں اور پھر نکل آتے ہیں ———

اے ہمتِ مردانہ! اس حصار کو ——— ہاں اس خود ساختہ حصار کو توڑ کر باہر آجا۔ دیکھ کتنے لوگ تیرے منتظر ہیں ——— انسانوں سے انسانوں کی طرح مل ——— ان کی خدمت کے لئے جان و تن سے حاضر رہ کہ انسانیت یہی ہے، شرافت یہی ہے، زندگی یہی ہے۔

لٹریچر یا بم

لٹریچر سے زیادہ کوئی مہلک ہتھیار نہیں خصوصاً دورِ جدید میں ——— ہاں عقل و دانش، ہوش و خرد کے اس دور میں ——— ذرائع نشر و اشاعت اس کے بال و پر ہیں ——— یہ بال و پر ایک صدی پہلے اتنے قوی نہ تھے جتنے آج ہیں ——— آناً فاناً ایک بات دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ جاتی ہے اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوتی اور پھر کیا ہوتا ہے؟ ——— دنیا ادھر سے ادھر ہو جاتی ہے، دیکھنے والے ہکا بکا رہ جاتے ہیں ——— دورِ جدید کے قوی بال و پر نے لٹریچر کو میزائل سے زیادہ مہلک اور خطرناک بنا دیا ہے ——— شاید ایسا مہلک اور خطرناک ہتھیار دنیا کبھی پیدا نہ کر سکے!

جو ممالک ایک خاص نظام کے تحت چل رہے ہیں وہاں اس نظام کے منافی کوئی بات نہیں سنی جاتی اور جہاں سنی جاتی ہے وہاں سخت پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں ——— نہ صرف نشر و اشاعت پر پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں بلکہ فکر و خیال پر بھی پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں، جس پر کوئی پہرا نہیں لگا سکتا، پہرا لگایا تو پھر یہ خیال بم بن کر پھٹ پڑتا ہے ——— اس لئے سرکش خیال کو لگام دیئے رہتے ہیں، ہشیار یہی کرتے ہیں ——— کسی کی سننے نہیں دیتے بس اپنی ہی سناتے ہیں۔

غریبوں کو روٹی چاہئے ——— سوئی دورِ جدید کی ایک بڑی حقیقت ہے جس نے ایمان جیسی متاعِ عزیز کو غربت ربود کر کے رکھ دیا ہے ——— اسی لئے حدیث میں ارشاد ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ احتیاج انسان کو کفر کے قریب کر دے۔ ——— ہاں تو جن کو خدا نے دیا ہے وہ محتاجوں کی مدد کرتے ہیں، کوئی شرط نہیں لگاتے ——— لیکن اس دور میں جن کو خدا نے خوب دیا ہے ان کی سخاوت بھی تجارت و سیاست کی نذر ہو گئی ہے ——— سمجھنے والے خوب سمجھتے ہیں ——— بہت کچھ دیتے ہیں، کچھ نہیں چاہتے مگر صرف اتنی بات کہ آپ ان کے لٹریچر کو اپنے ملک میں آنے دیں، پھیلانے کا انتظام وہ خود کر لیں گے، آپ کریں تو عنایت ہے ——— وہ چاہتے ہیں کہ یہ لٹریچر تمہاری لائبریریوں میں ہو، تمہارے بازاروں میں ہو، تمہاری گلیوں میں ہو، تمہارے گھروں میں ہو اور پھر تمہارے دلوں میں ہو ——— اور وہ تمہارے گھر میں ہوں ——— دیکھا کس ہوشیاری اور دانائی سے شب خون مارا ——— خبر تک نہ ہوئی ——— مگر اس راز کو وہی پا سکتا ہے جو لٹریچر کی اہمیت اور اس کی ہلاکت خیزیوں سے واقف ہو، جو علم و دانش سے آشنا نہیں، وہ اس کو بہت معمولی بات سمجھتا ہے ——— چند کتابیں اور اخبارات و رسائل آ گئے تو کیا ہو گیا؟ ——— کونسی قیامت آ گئی؟ ——— جی ہاں، قیامت آ گئی، دلوں کا حال بدل گیا! ——— عظیم انقلاب آ گیا۔

مغربی لٹریچر نے جس طرح عالمِ اسلام کا مزاج بدلا ہے وہ ہمارے سامنے ہے ——— جس سرزمین سے اسلام نکلا آج وہاں اسلام کی غربت کا منظر دیکھو! ——— سنو سنو! ہمارے ایک متشرع اور باریش دوست ایک اسلامی ملک تشریف لے گئے، ایک روز وہ ملاحظہ میں ہوٹل میں بیٹھے چائے نوش فرما رہے تھے، ایک مقامی شخص آیا اور سوال سے دریافت کیا ——— "کیا آپ یہودی ہیں؟" ——— انہوں نے فرمایا: "الحمد للہ مسلمان ہوں" ——— اس نے پھر پوچھا ——— "تو پھر ڈاڑھی کیوں رکھی ہے؟" ——— دیکھا آپ نے اسلام کی غربت کا حال! جہاں شعائرِ اسلام، شعائرِ کفر بن چکے ہوں وہاں کی زبوں حالی

کا کیا رونا رویا جائے!

ہمارے ایک پڑوسی ملک میں جب مغربی لٹریچر نے اپنا اثر دکھایا تو برقعے کھینچ کر اتار دیے گئے ——— خلوت نشینوں کو بنوک شمشیر بے پردہ کیا ——— یہ اسی لٹریچر کا فیض ہے جس کو لوگ بے اثر اور بے فیض سمجھتے ہیں۔

سنا ہے کہ حجازِ مقدس میں حرم شریف کے باہر مغربی رسائل عام طور پر فروخت ہوتے ہیں، کوئی پابندی نہیں ——— فحش تصویریں، فحش تحریریں، بے برقع پوشش خواتین دھڑا دھڑ خریدتی ہیں، پھر ان کا کیا بنتا ہے یا بنے گا، خدا ہی بہتر جانتا ہے ——— اور اب تو سنا ہے کہ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ میں ٹی وی بھی عام طور پر دیکھا جاتا ہے، اللہ رحم فرمائے! نہ معلوم عالمِ اسلام کا مستقبل کیا ہے ——— ٹی وی بری چیز نہیں لیکن اس کا غلط استعمال نہایت ہلاکت خیز ہے۔

فحش رسالوں کی ایک کرامت عرض کرتا چلوں ——— ایک عالم دین کے گھر میں جہاں رقص و سرود کا شائبہ تک نہ تھا، ایک تقریب میں مرد و زن جمع ہوئے ——— مرد جب کھانے میں مصروف ہوئے تو عورتوں نے بند کمرے میں ایک محفل جمائی ——— بند اس لئے کیا کہ کہیں مولوی صاحب نہ دیکھ لیں ——— ہاں تو محفل جمائی اور پھر جو اُن کی لڑکیوں نے ناچ دکھایا تو دیکھنے والے حیران رہ گئے ؎

کس بزم سے ایسا ناچ سیکھ کر آئی ہیں
پریاں اندر کی جس سے شرمائی ہیں

پوچھا کہ تم نے ناچ کہاں سے سیکھا، تم تو گھر کی چہار دیواری سے باہر بھی نہیں نکلتیں؟ ——— فرمایا "فلمی رسالوں سے!" ——— دیکھا آپ نے یہ ہے لٹریچر کی کرامت ——— جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے!

اے دانشورانِ قوم ذرا اس طرف تو دیکھو! ——— ہمارے علم و دانش، ہماری تہذیب و تمدن، ہمارے دین و مذہب، ہمارے فکر و شعور پر کیسا شب خون مارا جا رہا ہے!

کن کن راستوں سے دشمن جاں قلب و روح تک پہنچ چکے ہیں اور ہم پر چھا جانے کے لئے پر تول رہے ہیں!

اقرار و انکار

کہتے ہیں کہ جو شے نظر نہ آئے نہ مانیں گے ——— لیکن اگر اقرار و تسلیم کے لئے مشاہدہ شرط ہے تو کیا انکار کے لئے مشاہدہ شرط نہیں؟ ——— یہ تو ظلم اور سراسر ناانصافی ہے کہ اقرار کرنے والوں سے شہادت طلب کی جائے اور انکار کرنے والوں کو یونہی چھوڑ دیا جائے۔

اس بند کمرے میں کون ہے'! ——— 'کوئی نہیں'! 'کیا تم نے اندر جا کر دیکھا ہے'! ——— 'نہیں دیکھا تو نہیں' کمرہ بند ہے، ظاہر ہے اندر کوئی نہ ہوگا! لیکن ممکن ہے کہ کوئی ہو، اس لئے ہم تمہاری بات نہ مانیں گے جب تک دیکھ کر نہ بتاؤ کہ اندر کوئی نہیں' ——— اور مشاہدہ کی بات بھی عجیب ہے، ہوتا کچھ ہے، نظر کچھ آتا ہے ——— پانی سے بھرے کٹورے میں انگلیاں ڈالئے، ترا شیدہ اور چھوٹی چھوٹی نظر آئیں گی ——— چلتی ریل میں باہر دیکھئے، ہر چیز گھومتی نظر آئے گی ——— چاند کے کھڑکے سے بدلیاں چھٹتے دیکھئے یوں محسوس ہوگا کہ چاند ہوا سے باتیں کر رہا ہے ——— یہی آنکھ جس پر بہت ناز ہے، کیسی فریب کار ہے، ہوتا کچھ ہے، دکھاتی کچھ ہے ——— تو پھر اقرار و انکار کے لئے کس کا سہارا لیں، کچھ تو بتاؤ ——— عقل کا'! ——— نہیں نہیں یہ تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہے اور پھر ہر فرد کی عقل اپنی اپنی نہج پر سوچتی ہے، کس کی عقل کو رہنما بنائیں! ——— 'کل کی عقل کو'! ——— لیکن کل کی عقل بھی دھوکا دیتی ہے اور ایسا دھوکا دیتی ہے کہ بس دیکھا کیجئے ——— اسی عقل نے ایک زمانہ تک چاند کو زمین کا ٹکڑا سمجھا لیکن جب چاند پر قدم رکھا تو چودہ طبق روشن ہو گئے ——— جو اب تک سچ تھا وہ سراسر جھوٹ نظر آیا ——— عقل خود راہ کی متلاشی ہے اس لئے وہ ہماری کیا رہنمائی کر سکتی ہے! ——— تو پھر کس کو رہنما بنائیں'! ——— 'وحی الٰہی کو' جو صدائے حیات ہے، جو زندگی کی پکار ہے' ہاں اس

کی سنو اور جو سناتی جائے اقرار کرتے جاؤ ـــــ مگر یہ تو BLIND FAITH ہوا ہم تو دیکھنا چاہتے ہیں، ہم تو سمجھنا چاہتے ہیں ـــــ لیکن ذرا غور تو کرو کہ BLIND FAITH کے بغیر زندگی آگے نہیں بڑھ سکتی ـــــ ہمارا علم اس کے سہارے آگے بڑھتا ہے ـــــ ہماری زندگی اسی کے سہارے قدم بڑھاتی ہے۔

ہم نے امریکہ، روس، انگلستان، چین غرض بہت سے ملکوں اور شہروں کو نہیں دیکھا لیکن ہم ان پر ایسا ہی یقین رکھتے ہیں جیسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو ـــــ ہم نے دنیا کے مختلف معرکوں اور فتوحات کو دیکھا نہیں صرف تاریخ پڑھی ہے لیکن ہم اس تاریخ پر ایسا ایمان رکھتے ہیں کہ جیسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو ـــــ ہم نے تاریخ کی بے شمار شخصیتوں کو دیکھا نہیں صرف ان کی سوانح پڑھی ہیں لیکن ہم ان کو اس طرح مانتے اور تسلیم کرتے ہیں جیسے وہ ہماری جانی پہچانی شخصیتیں ہوں ـــــ ادھر اُدھر کیوں جائیں، اپنے گھر ہی میں دیکھیں ـــــ کونسا انسان مشاہدہ اور عقل کی بنیاد پر اپنی والدین کی نشاندہی کر سکتا ہے ـــــ بن دیکھے تسلیم کرنا پڑتا ہے اور سب تسلیم کرتے ہیں اور اس طرح تسلیم کرتے ہیں جیسے آنکھوں نے دیکھا ہو اور دل نے گواہی دی ہو۔

جب ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ تم نے دنیا کے ملکوں، شہروں، معرکوں، شخصیتوں اور خود اپنے کو بن دیکھے کیوں تسلیم کیا؟ ـــــ تو جواب یہی دیا جاتا ہے کہ دیکھنے والوں نے ہمیں پے در پے خبر دی ہے اور اتنی مسلسل خبریں دی ہیں کہ ہمیں اقرار کرتے ہی بن پڑی ـــــ بہت خوب! جواب بہت معقول ہے ـــــ لیکن جب ہم سے ماورا عالم آخرت کے متعلق سوالات کئے جاتے ہیں تو پھر ہمارے پاس بھی یہی جواب ہے ـــــ انبیاء و رسل نے پے در پے خبریں دی ہیں، ان مسلسل خبروں کی بنیاد پر ہم نے مانا اور ہمارے دل نے گواہی دی ـــــ اور ہاں ہمارے خبر دینے والے سب کے سب سچے اور امین تھے اور تمہارے خبر دینے والوں میں سب ملے جلے تھے لیکن پھر بھی ہم تمہاری بات تسلیم کرتے ہیں تو پھر تم ہماری بات کیوں تسلیم نہیں

کرتے! اور یہ کہتے ہو کہ دکھاؤ جب مانیں گے، سمجھاؤ تب تسلیم کریں گے ——— دورِ جدید میں سائنس کے بہت سے انکشافات نہ ہم نے دیکھے اور نہ ہماری عقل میں آتے ہیں لیکن ہم بلاچون وچرا تسلیم کرتے ہیں ——— تسلیم اسی لئے کرتے ہیں کہ یہ باتیں بہتوں نے دیکھی ہیں اور بہتوں کی سمجھ میں آگئی ہیں ——— تو پھر ہم بھی تو یہی کہتے ہیں کہ امورِ معاد کے متعلق انبیاء و رسل نے جو خبریں دی ہیں وہ بھی بہتوں کی سمجھ میں آگئی ہیں اور بہتوں نے ان کو دیکھ بھی لیا ہے تو پھر ان امور سے کیوں انکار کریں؟ ——— اگر ہم انکار کرتے ہیں تو پھر ہم کو ان سب امور سے انکار کرنا پڑے گا جو نہ ہماری آنکھ نے دیکھے اور نہ ہماری عقل نے پرکھے۔

ایمان ویقان

زندگی کو یقین کی ضرورت ہے، یقین اوراقِ حیات کا شیرازہ بند ہے، طائرِ خیال کو آشیاں کی ضرورت ہے، آشیاں جتنا بلند ہوگا اتنا ہی محفوظ ہوگا اسی لئے انبیاء و رسل نے ایسی ہستی سے لو لگائی جو بلند سے بلند ترین ——— وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے ———

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

بغیر تصورِ توحید کے کامیاب زندگی گزارنا مشکل ہے ——— کامیاب وہ نہیں جس نے لامحدود اسبابِ آسائش فراہم کئے، کامیاب وہ ہے جس نے سکون و اطمینان سے زندگی گزاری اور جب دنیا سے گیا تو اپنے ساتھ سکون و چین کی متاعِ گراں مایہ بھی لے گیا ——— یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً (اے نفسِ مطمئنہ اپنے رب کی طرف لوٹ جا، تیرا رب تجھ سے راضی اور اپنے رب سے تو راضی) ——— یہ ہے کامیابی و کامرانی ——— کوئی نہ سمجھے تو اس کا کیا علاج!

خدا کی یاد سکونِ دل و جاں ہے ——— موحدین کا کیا ذکر؟ منکرین کو اس کا نام لیے بغیر چارہ نہیں، سنیئے اور غور سے سنیئے۔

جازفِ استانِ فرعونِ وقت تھا، خدا کا منکر ـــــــ کسی کی مجال نہ تھی کہ اُف کر سکے،
یہ منکرِ خدا بسترِ مرگ پر لیٹا ہے، جاں کنی کا عالم ہے، درد و کرب میں مبتلا ہے، روح اس طرح
کھنچی جا رہی ہے جیسے خار دار جھاڑیوں سے پرنیاں و حریر ـــــــ مقربینِ بارگاہ اور اعیانِ
مملکت پاس کھڑے ہیں ـــــــ اچانک آواز آتی ہے :-

اللہ! اللہ!

یہ آواز سن کر حاضرین ہکا بکا رہ گئے ـــــــ ایک نے ہمت کر کے پوچھا : 'کیا آپ نے
مذہب قبول کر لیا ہے اور خدا کو تسلیم کر لیا ہے؟' ـــــــ جواب دیا، 'نہیں تسلیم تو نہیں کیا'
لیکن جب یہ نام لیتا ہوں تو کچھ سکون سا ملتا ہے، اللہ اللہ کے

قبضہ ہو دلوں پر کیا اس سے بھی سوا تیرا!

موت و حیات اور رزم و بزم ہر جگہ اس یقین کی ضرورت ہے ـــــــ ذرا تاریخ
اسلام کا مطالعہ کریں، کفار و مشرکین سے جنگوں کا حال پڑھیں، ایمان کی صداقت آشکار ہو جاتی
ہے۔

ایک ہی نسل کے، ایک ہی خاندان کے، ایک گھرانے کے افراد میدانِ جنگ میں آمنے
سامنے کھڑے ہیں ـــــــ ایک کثرت میں ہے دوسرا قلت میں، مگر آنکھیں یہ دیکھ رہی ہیں
کہ قلت، کثرت پر غالب آ رہی ہے، آخر کیوں؟ ـــــــ کیا یہ لوگ کسی دوسری نسل کے ہیں؟
نہیں نہیں، ایک ہی نسل ہے، ایک ہی خاندان ہے ـــــــ پھر یہ قوت کہاں سے آئی؟
ـــــــ یہ ایمان کی قوت ہے، یہ یقین کی قوت ہے ـــــــ ایک اپنے سامنے موت
کے سائے منڈلاتے ہوئے دیکھتا ہے، دوسرے کی نظر میں جنت کی بہاریں ہیں، پھر کیوں
نہ وہ اپنے محبوب کی طرف لپکے ـــــــ ہاں یہ پلک جھپکتے ہی جنگ کا نقشہ بدل دیتی
ہے اور آن کی آن میں قوی سے قوی دشمن زیر ہو جاتا ہے۔

غم اور ضبطِ غم

حضرات اہل اللہ کے ذکر و فکر میں سکون ہی سکون ہے، سرور ہی سرور ہے ——— یہ وہ حضرات ہیں جن کی حیاتِ اقدس کے مطالعے سے ایک نیا اندازِ فکر ملتا ہے، آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں، دل روشن ہو جاتے ہیں، زندگی روشن ہو جاتی ہے۔

دنیا میں قدم قدم پر آزمائشیں ہیں ——— ان آزمائشوں سے حسن و خوبی کے ساتھ گزر جانا کوئی آسان بات نہیں اس کے لئے بے مثال ہمت و حوصلے کی ضرورت ہے ——— یہ ہمت و حوصلہ اولیاء اللہ کی پاک زندگیوں سے ملتا ہے، وہ ایک روشن مینار ہیں جو زندگی کی تاریک راہوں میں ہماری رہنمائی کرتی رہتی ہیں۔

زندگی میں انسان مختلف حادثات سے دوچار ہوتا ہے ——— ہر حادثہ محبت کی آزمائش ہے کیونکہ آزمائش کے بغیر محبت کی صداقت کا اندازہ لگانا مشکل ہے، اسی لئے مولائے کل نے ارشاد فرمایا کہ ہم تمہاری محبت و اخلاص کو آزمائیں گے ——— خوف سے آزمائیں گے، بھوک سے آزمائیں گے، اموال و ثمرات اور جانوروں کو ضائع کر کے آزمائیں گے ——— سب سے بڑی آزمائش جان کی آزمائش ہے، پھر اولاد کی جان جو اس دنیا میں انسان کی محبوب ترین متاع ہے، اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس آزمائش میں مبتلا کیا گیا اور دنیا کو یہ دکھایا گیا کہ ہمارے چاہنے والے ہم کو کس طرح چاہتے ہیں، جانِ عزیز سے بھی دریغ نہیں کرتے ؎

دل ہو کہ جان تجھ سے کیا کہ عزیز رکھئے
دل ہے سو چیز تیری، جاں ہے سو مال تیرا۔

انسان کی زندگی میں اولاد کی دائمی مفارقت ایک المناک حادثہ ہے، اس کی شدت کا اندازہ وہی حضرات کر سکتے ہیں جنہوں نے یہ نعمت پا کر کھوئی ہو ——— حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ مبارکہ میں پے در پے تین حادثات پیش آئے ——— تین ہونہار

صاحبزادے طاعون کی وبا میں دیکھتے ہی دیکھتے جدا ہو گئے (۱۰۲۵ھ) بڑے صاحبزادے خواجہ محمد صادق علیہ الرحمہ جواں سال تھے، ۲۴ سال کی عمر تھی لیکن علم و فضل میں یگانہ تھے اور روحانیت میں بھی یکتائے روزگار، حضرتِ مجدد کے ان کلماتِ مقدسہ سے صاحبزادہ مرحوم کی روحانیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، آپ فرماتے ہیں :-

"فقیر اینجا در رنگِ مسافراں در ولایتِ ایشاں نشستہ است"

(مکتوباتِ امامِ ربانی، جلد اول، مکتوب نمبر ۲۴۴)

(ترجمہ) فقیر یہاں مسافروں کی طرح ان کی ولایت میں بیٹھا ہے۔

دوسرے صاحبزادے خواجہ محمد فرخ علیہ الرحمہ ہیں، ۱۱ سال کی عمر تھی لیکن اس نوعمری میں عذابِ آخرت کا خوف اس قدر غالب تھا کہ حضرت مجدد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں :-

"عذابِ آخرت سے لرزاں و ترساں رہتے تھے اور دعا کرتے تھے کہ خدا کرے بچپن ہی دنیا سے اٹھا لیا جاؤں تاکہ عذابِ آخرت سے نجات مل جائے۔ جو لوگ مرضِ موت میں آپ کی تیمارداری کر رہے تھے انہوں نے بڑی عجیب عجیب باتیں مشاہدہ کیں" (زبدۃ المقامات، ص ۳۰۵)

تیسرے صاحبزادے خواجہ محمد عیسیٰ علیہ الرحمہ تھے، صرف آٹھ سال کی عمر تھی لیکن لوگوں نے آپ کی بہت سی کرامات مشاہدہ کیں، حضرتِ مجدد تحریر فرماتے ہیں :-

"آٹھ سال کی اس مختصر عمر میں لوگوں نے محمد عیسیٰ کی جو کرامات مشاہدہ کیں ان کو کیا بیان کیا جائے" (زبدۃ المقامات، ص ۳۰۵)

اللہ اللہ یہ تینوں صاحبزادے آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گئے حضرتِ مجدد کے قلبِ حزیں پر کیا کچھ نہ گزری ہو گی لیکن پائے استقامت میں ذرا تزلزل پیدا نہ ہوا اور فرمایا تو یہ فرمایا :-

"یہ جواہرِ نفیسہ تھے جو امانۃً ہمارے سپرد کئے گئے تھے، خدا کا شکر و احسان

ہے کہ ان امانات کو دل تنگی کے بغیر صاحبِ امانت کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔" (زبدۃ المقامات، ص ۳۰۹)

بلکہ ہم ہیں تیرے دولتیں تیری

زندگی کے ان عظیم حادثات کو برداشت کرنے کے لئے بڑی ہمت اور حوصلہ کی ضرورت ہے — غم و الم کے ایسے ہی موقعوں پر محبوب و نامحبوب میں دن کے اجالے اور رات کی تاریکی کی طرح ممتاز نظر آتی ہیں — نامحبوب جفائے محبوب پر چیختے چلاتے ہیں اور محبوبِ جفائے محبوب کو نظرِ محبت سے دیکھ کر وفا سے زیادہ لطف پاتے ہیں ؎

تیری مرضی جو دیکھ پائی ہے
خلشِ درد کی بن آئی ہے

اولاد کا اٹھ جانا یقیناً غمناک و المناک ہے لیکن کسی کے ننگ و ناموس کا خاک میں مل جانا کچھ کم غمناک نہیں — حضرت مجددؒ نے ذلت و رسوائی کے اس عظیم سیلاب کو جو راہِ محبت میں آئے بغیر نہیں رہتا، بے مثال استقامت سے برداشت کیا اور اعجازِ عزیمت سے اس کا رخ پھیر دیا۔

جب منعمِ حقیقی اپنے پیارے بندوں کو بیکراں نعمتوں سے نوازتا ہے تو کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنے اور بیگانے جلنے لگتے ہیں اور دشمن جال بن جاتے ہیں — مخالفت کا ایک طوفان کھڑا کر دیتے ہیں — لیکن صاحبِ عزیمت خندہ پیشانی سے ساری مخالفتیں برداشت کرتا ہے اور اس قوتِ برداشت سے اس کی حقیقی عظمت جلوہ گر ہوتی ہے — اپنی زندگی کے آخری دور میں حضرت مجددؒ کو ایسی مخالفت سے سابقہ پڑا — بدخواہوں کی ایک جماعت آپ کے اور آپ کے خلفاء کے در پے آزار تھی لیکن آپ نے خلفاء کو یہی ہدایت فرمائی کہ مخالفین کی ذرہ برابر پروا نہ کریں اور یادِ الٰہی میں مصروف منہمک رہیں — جس کی نظروں میں وہ بس گیا ہو اور جس کے دل میں وہ سما گیا ہو

اس کے قلب و نظر میں غیر کا کہاں گزر!

حضرتِ مجدد کے خلیفہ خواجہ محمد نعمان علیہ الرحمہ جب مخالفین کی تکلیف دہ باتوں سے رنجیدہ اور کبیدہ خاطر ہوئے تو حضرتِ مجدد نے یہ تلقین فرمائی :۔

"آپ خسارے میں رہنے والے لوگوں کی پریشاں باتوں سے رنجیدہ اور غمزدہ نہ ہوں، ہر شخص اپنے طریقے کے موافق عمل کرتا ہے، مناسب یہ ہے کہ انتقام اور بدلے کے در پے نہ ہوں ——— جس کام میں آپ مشغول ہیں اسی میں کوشش کرتے رہیں، دوسری باتوں سے آنکھیں بند کر لیں"

(مکتوباتِ امامِ ربانی جلد اول، مکتوب نمبر ۲۰۴)

ایک دوسرے مکتوب گرامی میں مولانا قاسم علیہ الرحمہ کو تحریر فرماتے ہیں :۔

"جس نے کوئی نیک کام کیا تو وہ اس کے اپنے نفس کے لئے ہے اور جس نے کوئی برائی کی وہ اسی کے لئے وبال ہے خواجہ عبداللہ انصاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں" الٰہی جس کو تو تباہ کرنا چاہتا ہے اس کو تو ہمارا دشمن بنا دیتا ہے" (مکتوباتِ امامِ ربانی، جلد اول، مکتوب نمبر ۱۱)

کیسی دل لگتی بات فرمائی اور کس مناسب موقع پر قرآنِ کریم کے اس ارشاد کو یاد دلایا کہ جس نے کوئی برائی کی وہ اسی کے لئے وبال ہے پس کسی کے برائی چاہنے سے کبیدہ خاطر نہ ہونا چاہئے کیونکہ سوائے اللہ کے کوئی نقصان پہنچانے والا نہیں، جب کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تو پھر غیر کا اندیشہ کیوں ؟ ؎

حیات کیا ہے خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گونا گوں

اگر حضرتِ مجدد چاہتے تو مخالفین کی سرکوبی فرما سکتے تھے ——— حکومت میں آپ کا بڑا اثر و رسوخ تھا لیکن دشمنوں کی سرکوبی کو آپ نے عزیمت کے خلاف سمجھا ———

مخالفین کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ آپ کی عزت و ناموس کے درپے ہو گئے ——
جہانگیر بادشاہ کو آپ سے بدظن کر دیا چنانچہ اس نے آپ کو اپنے دربار میں طلب کیا،
چند استفسارات کئے، آپ نے معقول جوابات دئے —— لیکن چونکہ آپ نے
آدابِ شاہی کے مطابق سجدہ تعظیم نہ کیا تھا، جہانگیر کو یہ بات سخت ناگوار معلوم ہوئی ——
پندارِ شاہی میں بصارت و بصیرت دونوں ختم ہو جایا کرتی ہیں اور انسان اپنے آقا و مولیٰ کو
بھول کر خود آقا و مولیٰ بن بیٹھتا ہے لیکن جن حضرات نے مولائے حقیقی کی محبت کا مزا چکھ لیا
ہے وہ معبودانِ باطل کو خاطر میں نہیں لاتے بلکہ نگاہیں پھیر لیتے ہیں ؎

ان کی نظر میں شوکتِ حشمت نہیں کسی کی
آنکھوں میں بس رہا ہے جن کے جمال تیرا

حضرت مجدد ایک مکتوبِ گرامی میں محبوبانِ خدا کی عالی حوصلگی کا ذکر کرتے
ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

" انہیں اس بات سے عار ہوتی ہے کہ شاہی تخت کے تعلقات
سے آسودہ ہوں، وہ اس بات کو ننگ سمجھتے ہیں کہ ملکِ خداوندی میں لات و
عزیٰ کو شریک بنائیں " (مکتوبات امامِ ربانی، جلد اول، مکتوب نمبر ۱۷۴)

حضرتِ مجدد محبتِ الٰہی میں سرشار تھے، کائنات سے بے نیاز تھے ؎

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

آپ نے ذلت و رسوائی کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا مگر غیر کے آگے
سر نہ جھکایا —— اور جب شاہجہان نے یہ کہلوایا کہ فقہا نے سجدۂ تعظیم کو جائز لکھا ہے
تو آپ نے فرمایا :-

" یہ تو رخصت ہے، عزیمت یہ ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ نہ کیا

جلائے : (سبحۃ المرجان، ص ۴۹)

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

علامہ اقبال نے حضرتِ مجدّد کی اسی عزیمت کو دیکھ کر کہا تھا ؎

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

بہرکیف جہانگیر نے غیظ و غضب کے عالم میں حضرتِ مجدّد کی نظر بندی کے احکام جاری کئے اور ایک ہندو افسر کے سپرد کیا کہ قلعہ گوالیار میں قید کر دے جہاں حکومت کے باغیوں کو قید کیا جاتا تھا ــــــ اللہ اللہ! دینِ اسلام کا یہ محافظ ایک ہندو افسر کے ہاتھوں اسیر ہے ــــــ رسوائی سی رسوائی ہے! ــــــ نہ معلوم عتابِ شاہی کے بعد آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ــــــ دہلی سے گوالیار کس طرح لیجایا گیا اور قلعہ گوالیار میں کیا معاملہ کیا گیا ــــــ جس شمع کے ارد گرد ہزاروں پروانے فدا ہوا کرتے تھے، آج وہ تنہا فروزاں ہے، مجلس سُونی ہے، کوئی پاس نہیں ــــــ مؤرخ کا قلم خاموش ہے، کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوا، ہاں جب شہادت کی خبر نے دلوں کو مضطر کیا تو ایک دشمن ضمیر مجذوب نے فرمایا :-

"آپ کو شہید تو نہیں کیا گیا ہاں آپ کے پیروں میں بیڑیاں ڈالدی گئی ہیں "

اللہ اللہ! اس پائے مبارک میں بیڑیاں ڈالی گئیں جس کی گردِ راہ کے سامنے ستارے بھی شرمسار ہیں ؎

اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے

بہرکیف جو نہ کرنا تھا جہانگیر نے وہ سب کچھ کیا ــــــ خوب خوب ذلیل و رسوا

کیا ـــــــ اہل خانہ کے پاس جو کچھ بچا دہ بھی سے لیا گیا اور ان کو بے آسرا کر دیا گیا لقمۂ حیات تنگ کر دیا گیا ـــــــ لیکن حضرت مجدد نے ان جفا شعاریوں کا کوئی جواب نہ دیا ـــــــ یہ نہیں کہ آپ مجبور تھے ـــــــ نہیں نہیں اعیانِ مملکت میں آپ کے بہت سے مخلصین و معتقدین اور مریدین تھے، ذرا سے اشارے پر ایک انقلابِ عظیم برپا ہو جاتا ـــــــ لیکن جو مقامِ رضا پر پہنچ چکا ہو اس کی زندگی سے لفظِ "انتقام" نکال دیا گیا ہے کیسا انتقام؟ کس کا انتقام! ـــــــ اہلِ رخصت کو انتقام مبارک ہو لیکن اہلِ عزیمت تو دست و بازوئے قاتل کو چومتے نظر آتے ہیں ؎

آں کشتۂ بیچ حقِ محبت ادا نہ کرد
کز بہر دست و بازوئے قاتل دعا نکرد

حضرت مجدد نے قلعہ گوالیار سے جو مکاتیب ارسال فرمائے ہیں ان کو پڑھ کر ایک نئی روشنی ملتی ہے اور زندگی میں ایک عجیب حرارت محسوس ہوتی ہے ـــــــ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بیدار کر رہا ہو، جیسے کوئی پستیوں سے بلندیوں کی طرف لے جا رہا ہو جیسے کوئی رازِ حیات سے آشنا کر رہا ہو، جیسے کوئی زندگی اور لطفِ زندگی دے رہا ہو۔

قلعہ گوالیار میں پہنچنے کے بعد شیخ فتح اللہ کو تحریر فرماتے ہیں :-

"آپ نے جفا اور ملامتِ خلق کے بارے میں تحریر فرمایا ہے، یہ تو اس گروہِ سالکین کا حسن و جمال ہے، ان کے رنگ میں اس سے نکھار پیدا ہوتا ہے، پھر اس سے دل تنگی اور کدورت کیوں ہو؟ جب فقیر اس قلعے میں پہنچا تو اوائلِ حال ہی میں محسوس ہوتا تھا کہ ملامتِ خلق کے انوار شہروں اور دیہاتوں سے نورانی بادلوں کی طرح پے در پے پہنچ رہے ہیں اور میرے معاملے کو پستی کی طرف سے بلندی کی طرف لے جا رہے ہیں"

(مکتوباتِ امام ربانی، جلد سوم، مکتوب نمبر ۶)

خواجہ میر محمد نعمان کو لذتِ آزار سے لطف اندوز ہونے کی تلقین فرماتے ہیں :۔

"آپ دوستوں سے کہدیں کہ وہ دل تنگی دور کریں اور جو لوگ درپئے آزار ہیں ان کی طرف سے بد دل نہ ہوں بلکہ ان کے فعل سے لذت حاصل کریں"

(مکتوباتِ امام ربانی، مکتوب نمبر ۱۰)

سبحان اللہ! کیا تلقین و ہدایت ہے ——— نہ صرف یہ کہ دشمنوں کی ایذا رسانی سے دل تنگ نہ ہوں بلکہ اس ایذا رسانی سے لطف حاصل کریں ——— نظر میں یہ بلندی جبھی پیدا ہوتی ہے جب انسان کاملین کی صحبت سے مستفیض ہوتا ہے۔

عین بلاہیں صاحبزادگان کو کس کمال تسلیم و رضا کا درس دیتے ہیں، فرماتے ہیں :۔

"نصیحت یہی ہے کہ کوئی مراد اور کوئی خواہش باقی نہ رہے ———

خواہشاتِ نفسانی کو جو معبودانِ باطل ہیں "لا" کے تحت نہ لاؤ تاکہ سب منتفی ہو جائیں اور دل میں کوئی مقصود اور کوئی مراد باقی نہ رہے حتیٰ کہ میری رہائی جو اس وقت تمہارا مقصدِ اہم ہے وہ بھی تمہاری مراد نہ رہے اس کی تقدیر اور اس کے فعل و ارادے پر راضی رہو"

(مکتوباتِ امام ربانی، مکتوب نمبر ۲)

ایک اسیرِ زنداں کا اپنے بیٹوں کو یہ لکھنا کہ اللہ کی محبت میں وہ محویت حاصل کرو کہ ساری تمنائیں اور آرزوئیں محو ہو جائیں، حتیٰ کہ میری رہائی کی آرزو بھی تمہارے دل سے نکل جائے، کوئی معمولی بات نہیں، بہت بڑی بات ہے ——— اور خود اس کی محویت کا یہ عالم ہے کہ جفاؤں میں وفا سے زیادہ لذت پا رہا ہے ——— شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ کے نام ایک مکتوب میں اس رازِ محبت کی طرف یوں اشارہ فرماتے ہیں :۔

"محبوب کے افعال تو سب ہی میٹھے ہیں، جو ماسوا اللہ کی محبت میں گرفتار ہو اس کو کڑوے لگتے ہیں، درد مند تو محبوب کی دی ہوئی مصیبت میں اس قدر لذت و حلاوت پاتے ہیں کہ انعام میں بھی متصور نہیں ——— ہر چند کہ دونوں

اٹھاتا تھا اور اُن کو مزا آتا تھا لیکن اہلِ خرافت، مصائب کے حسن کا کیا اندازہ کر سکتے ہیں۔"

حضرت مجدد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غموم و آلام کو برداشت ہی نہ کیا بلکہ غمِ دوراں میں حسنِ جاناں کا مشاہدہ فرمایا ——— جب تک یہ بصیرت پیدا نہیں ہوتی، زندگی، زندگی نہیں بنتی ——— مولیٰ تعالیٰ اپنے محبوبوں کے صدقے ہم کو لذتِ جفا سے آشنا فرمائے اور وہ نظر عطا فرمائے جو غمِ گیتی میں جمال و زیبائی کے سوا کچھ نہ دیکھے آمین ثم آمین۔

نظر نظر کی بات

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں کائنات کو اس طرح دیکھ رہا ہوں جیسے ہتھیلی پر رائی کا دانہ" ——— اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "میں اس ذرے میں مشاہدۂ کائنات کر رہا ہوں" ——— کیسی عجیب بات ہے، جو ہم کو نظر نہیں آتا وہ ان حضرات کو کیسے نظر آگیا؟ ——— شاید یہ مبالغہ ہے (معاذ اللہ) ——— جو قرآن و حدیث میں آیا ہے اور تصوف کی کتابوں میں لکھا ہے کچھ سمجھ سے بالاتر ہے ——— نہیں نہیں نظر کی ضرورت ہے، سب کچھ سمجھ میں آ سکتا ہے ——— شعبۂ حیاتیات کی تجربہ گاہ میں جائیے، شیشے کی سلائیڈ پر تل جیسی کوئی چیز چپکی ہے ——— یوں نظر نہیں آتی غور سے دیکھو تو نظر آتی ہے، بظاہر یہ سلائیڈ شیشے کا ایک صاف شفاف ٹکڑا معلوم ہوتا ہے لیکن جب اس کو خوردبین کے اندر رکھ جاتا ہے تو وہی تل جو نظر نہ آتا تھا، ایک نئی بہارِ حسن کے ساتھ جلوہ گر ہے، آنکھیں کھل جاتی ہیں اور دل روشن ہو جاتا ہے ——— جس آنکھ نے ابھی ابھی کچھ نہ دیکھا تھا، اب وہ سب کچھ دیکھ رہی ہے، جبھی تو میر تقی میر نے کہا تھا ؎

جہاں جلوے سے اس محبوب کے یکسر لبالب ہے\
نظر پیدا کر اوّل پھر تماشا دیکھ قدرت کا

ایک وہ ہیں جو اسباب کے محتاج ہیں اور ایک وہ ہیں جو اسباب سے بے نیاز ہیں خدا نے ان کو وہ بصیرت و بصارت دی ہے کہ کسی خوردبین کی ضرورت نہیں۔

غالباً بات سمجھ میں آگئی ہوگی، نہ آئی ہو تو ایک اور تجربہ کیجئے :-

غالب کا ایک شعر لکھیئے، نابینا کو دکھائیے، پڑھنا اور تشریح کرنا تو کجا اس کو کچھ بھی نظر نہ آئے گا ——— پھر ایک اَن پڑھ بینا کو دکھائیے، وہ بھی کچھ نہ بتا پائے گا، بس اتنا ہی بتا سکے گا کہ کاغذ پر دو سیاہ لکیریں نظر آرہی ہیں ——— آگے بڑھئے، طفلِ مکتب کو دکھائیے شاید وہ کچھ پڑھ پائے ——— اور آگے چلئے، کسی سکول کالج کے طالب علم کو دکھائیے، یہ شعر تو پڑھ لے گا (اور شاید صحیح نہ پڑھ سکے) مگر مطلب بتانا اس کے بس کی بات نہیں، ممکن ہے کہ کوئی ہونہار طالب علم بتا دے ——— ہاں اور آگے بڑھئے کسی استادِ کامل کو دکھائیے، وہ اس شعر کو دیکھتے ہی ایسی تقریر کرے گا کہ آپ ہکا بکا رہ جائیں گے، پھر آپ پر یہ عقدہ کھلے گا کہ ان دو مصرعوں میں جہانِ معنیٰ آباد ہے، کچھ بعید نہیں کہ وہ یہ دعوےٰ کرے کہ میں اس شعر پر دفتر کے دفتر سیاہ کر سکتا ہوں ———

دیکھا آپ نے! ——— ایک ہی شعر ہے، سب کی نظریں اس پر پڑ رہی ہیں، کسی کو کچھ نظر نہ آیا، کسی کو کچھ نظر آیا مگر بتا نہ پایا، کسی نے کچھ پایا، کسی نے دریا بہایا ——— نظر نظر کی بات ہے ——— اسی لئے تو غالب کہتا ہے ؎

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

یہ کہنا کہ انبیاء علیہم السلام اور صوفیاء جو بتاتے ہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا، اس لئے لغو ہے (معاذ اللہ، استغفر اللہ) ایسا ہی ہے جیسے نابینا یہ کہے کہ جس کاغذ پر غالب کا شعر لکھا ہے اس کا سرے سے وجود ہی نہیں، یا اگر اس کا وجود ہے تو کم از کم شعر کا تو وجود ہی نہیں کہ نظر نہیں آتا ——— یا اَن پڑھ بینا یہ کہے کہ اس کاغذ پر تو دو سیاہ لکیروں کے سوا کچھ نہیں اور یہ جو کچھ اس کی تشریح میں دریا بہائے گئے ہیں سب لغو و بیہودہ ہیں ——— ظاہر ہے مدعی کے اس دعوےٰ سے حقیقت کی لغویت نہیں بلکہ مدعی کی لغویت اور حماقت ظاہر ہوتی ہے۔

تاجداری و خاکساری

رسم تاجپوشی خدا جانے کس نے ایجاد کی، معقولیت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ——— حضرتِ انسان کے فکر و شعور میں سجدہ ریزی کا جو خیال کروٹیں بدلتا رہتا ہے، شاید یہ اسی خیال کا ایک بھونڈا اظہار ہے اور اسی ذوق کی ایک ناتمام تسکین ہے ——— ایک انسان، ہاں ایک انسان، مٹی کا بنا ہوا انسان، فانی انسان، مجبور و بیکس انسان ——— جس کی زندگی اس کے ہاتھ میں نہیں، جو وہ نہیں کر سکتا جو وہ چاہے، اس کی زندگی اور اس کی چاہت ممتازِ مطلق کے ہاتھ میں ہے ——— ہاں ذرا دیکھو تو سہی، یہی انسان، خلعتِ فاخرہ زیبِ تن کئے، تاجِ شاہی سر پر رکھے، عصائے نخوت ہاتھ میں لئے، اکڑتا جا رہا ہے ——— اور ذرا ادھر بھی دیکھو، یہ بھی انسان ہیں، صف بہ صف کھڑے ہیں، سر جھکائے جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں، بدن پر کپکپی، ہاتھ میں رعشہ، خوف و دہشت سے لرزاں و ترساں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ! ——— ایک انسان کا اس ذلت و رسوائی پر راضی ہو جانا اور اس کو باعثِ فخر سمجھنا تاریخِ انسانیت کا ایک زبردست المیہ ہے ——— مگر دیکھنے والوں کو یہ المیہ طربیہ معلوم ہوتا ہے۔

ہزاروں درود و سلام ہوں اس انسانِ کامل پر جس نے طلسمِ تاجداری توڑ کر انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلائی ——— خدا کے آگے جھکایا اور انسان کو انسان کے ساتھ انسانوں کی طرح رہنا سکھایا ——— جس نے پندارِ شاہی کے زعم میں کسی کی عزت و ناموس کو خاک میں نہیں ملایا ——— جس نے سب کو محترم بنا کر آسمان کی بلندی تک پہنچایا۔

انسان میں فطرۃً اکڑ ہے اسی لئے خدا نے اپنے بندوں کو سمجھایا کہ دیکھو اکڑا نہ کرو، تمہارے اکڑنے سے نہ زمین پھٹ جائے گی اور نہ تم پہاڑ کی چوٹیوں تک جا پہنچو گے ——— پھر کیوں اکڑتے ہو! ——— ہمیں ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں ——— زمین پر اس طرح چلو جیسے خاکسار چلا کرتے ہیں وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (اللہ کے پیارے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں)

یادِ رفتگاں

نہ معلوم کب سے مرنے جینے کے دن منائے جاتے ہیں ——— یہ ایک رسم قدیم ہے ، بہت اچھی رسم ہے ، قرآن کریم نے ان دونوں کے علاوہ تیسرے دن کا بھی ذکر فرمایا ہے ، یوم حشر و نشر ——— ہاں تو بظاہر اس رسم کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ بچھڑے ہوئے بزرگوں کی یاد تازہ کی جائے ، ان کے روشن کردار ، ان کی روشن تعلیمات کو اپنایا جائے ——— مگر ہوتا یہ ہے کہ مرحومین کے کردار و تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے اور ایسے ایسے پروگرام مرتب کئے جاتے ہیں کہ شاید یہ خراج عقیدت پیش کرنے والوں پر مرحومین کی روحیں نفرین کرتی ہوں ۔

شہید کربلا کا دن منایا جاتا ہے ——— ضرور منایا جانا چاہئے ——— جس نے حق کی خاطر جانِ عزیز قربان کی ہو اس کی یاد کیوں نہ منائی جائے ——— وہ سرگروہ احرار تھا ، اس کے دم سے ایمان کی رونق ہے ، وہ شہید ہے ، وہ جوانانِ جنت کا سردار ہے ، وہ دوشِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سوار ہے ، وہ زندۂ جاوید ہے ، وہ جنت کی بیکراں نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے ، اس کے لطف و سرور کا کون اندازہ کرسکتا ہے ——— قیامت کے دن ان کا رب ان کو اتنا دے گا اتنا دے گا کہ ہم تصور بھی نہیں کرسکتے ——— ذرا سوچو تو سہی کہ ایسے شہید ناز کی یاد کس طرح منائی جاتی ہے ——— کیا جو کچھ ہم کرتے ہیں اس کے شایانِ شان ہے ! ——— عقلِ سلیم جواب دے ! ——— جو اس نے کیا ہم وہ نہیں کرتے اور جو اس نے نہ کیا وہ ہم کرتے ہیں ——— یہ کیسی محبت ہے ، یہ کیسا عشق ہے ، یہ کیسی وارفتگی ہے ، یہ کیسی شیفتگی ہے ، یہ کیسی جاں نثاری ہے ، یہ کیسی فداکاری ہے ، یہ کیسی اطاعت شعاری ہے ، یہ کیسی وفاداری ہے ؟ ——— خدارا کچھ تو بتاؤ !

دل میں ایک بات رہ رہ کر آتی ہے ، آپ کو بھی بتا دوں ——— انسان ابتلاء سے گزر کر معراجِ کمال پر پہنچتا ہے لیکن معراجِ کمال پر پہنچنے کے بعد کوئی شخص اس کے دورِ ابتلاء

کی یاد نہیں منایا بلکہ اس کو جو نعمت ملی ہے اس پر خدا کا شکر ادا کیا جاتا ہے ——— سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم معراج منایا جاتا ہے، یوم ولادت منایا جاتا ہے ——— دھوم دھام سے منایا جاتا ہے ——— لیکن طائف کے بازاروں میں اس جانِ حزیں پر جو کچھ گزری تھی اور جس کے متعلق اس نے فرمایا تھا کہ زندگی کی سب سے کٹھن گھڑی گزری تھی ——— ہاں اس کی یاد منا کر کوئی سینہ کوبی نہیں کرتا ——— وہ ایک آزمائش تھی آنی و وقتی ——— اب عیش جاودانی ہے، اس پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور آپ کے محامد و محاسن بیان کرتے ہیں ——— یہی شہیدِ کربلا کی یاد میں کیا جانا چاہیئے ——— ہاں اس پر ضرور ماتم کیا جانا چاہیئے کہ جو متاعِ گراں مایہ خدا نے ہم کو دی تھی اس کو ہم نے اپنے ہاتھوں کربلا میں لٹا دیا، لیکن یہ کام وہ کرے جو حسینی لشکر میں نہ تھا، ہاں اس کو پچھتانا چاہیئے اور وہ سب کچھ کرنا چاہیئے جو پرلے درجہ کا گناہگار و سیہ کار احساسِ ندامت کے بعد کیا کرتا ہے ——— لیکن جو حسینی لشکر کے ساتھ تھے ان کو حسین رضی اللہ عنہ کی بے پناہ استقامت و استقلال پر فخر ہے ——— دشمنوں نے شہید و پامال کیا لیکن شہیدِ عشق کو کوئی پامال نہیں کر سکتا اور نہ وہ شکست کھا سکتا ہے ——— فتح و نصرت اس کے قدم چومتی ہے اور تاجِ کامرانی اس کے فرقِ اقدس پر رکھا جاتا ہے ؎

آناں کہ غمِ تو بر گزیدند ہمہ
در کوئے شہادت آرمیدند ہمہ
در معرکۂ دو کون فتح از عشق است
باآں کہ سپاہِ او شہیدند ہمہ

مزارات و مقابر

حضرات اہل اللہ کی یاد منانا بڑا اچھا مشغلہ ہے ——— خصوصاً اس دور میں جب کہ غیر تہذیبی غیر اخلاقی اور غیر مذہبی مشاغل نے ہمارے فکر و شعور پر ڈاکہ ڈالا ہے ——— اولیاء اللہ کے ذکر و فکر میں سکون ہی سکون ہے،

چین ہی چین ہے کہ ان کے دل میں چین ہے ——— ہم چین کو باہر تلاش کرتے ہیں لیکن چین تو اندر ملتا ہے ؎

کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ!

ہاں تو اصلاحِ منکر و شعور کے لئے اہل اللہ کی یاد تریاق و اکسیر کا حکم رکھتی ہے مگر اب ان مشاغل کی اخلاقی اور روحانی حیثیت کچھ کم ہو گئی ہے ——— اقتصادی اور معاشی اہمیت زیادہ ——— ہزاروں کے پیٹ پلتے ہیں ——— فتوحات میں فراوانی کے لئے قبریں بھائی جاتی ہیں اور گنبد بنائے جاتے ہیں اور عرسوں میں دھوم مچائی جاتی ہے ——— دور افتادہ قبریں دیکھتے ہی دیکھتے آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہیں ——— سابقین نے جس مشغلے کو اصلاحِ حال کے لئے اپنایا تھا، اب یہ ایک منفعت بخش فن بن کر رہ گیا ہے ——— حصولِ منفعت کے لئے کیا کیا جتن کئے جاتے ہیں ——— سنیئے تاکہ عبرت ہو اور اگر ممکن ہو تو اصلاحِ حال کی کوشش کی جائے۔

۱۔ دس برس پہلے کی بات ہے، ملازمت کے سلسلے میں میرپور خاص میں مقیم تھا ——— روزانہ شام کو رفیقوں کے ساتھ حیدرآباد روڈ پر ٹہلنے جایا کرتا تھا، ایک قبر کے پاس سے گزر ہوتا جو نہر کے کنارے تھی، پاس ایک مجاور ہوتا، چادر چڑھی ہوتی، پھول ڈلے ہوتے، فتوحات کا سلسلہ جاری ہوتا ——— ایک روز ٹہلتے ٹہلتے یہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نہ وہ مجاور ہے، نہ وہ قبر ہے، نہ وہ چادر نہ وہ پھول، میدان صاف ہے جیسے یہاں کچھ تھا ہی نہیں ——— یقین نہ آتا تھا کہ یہ وہی مقام ہے ——— رفیقوں نے تصدیق کی تو یقین آیا ——— قبر کیا ہوئی ایک خوانچہ ہو گیا ——— جہاں چاہا لگایا، جہاں سے چاہا اٹھایا۔

۲۔ اور سنیئے ——— ایک صاحب کو کیا سوجھی خالی ڈھنڈار گھر میں ایک پرانے قبرستان سے نہ معلوم کب کب کی پرانی قبروں کے تعویذ اٹھا کر لائے اور اس خالی گھر میں ایک ایک کر کے جما دیئے، پھر مشہور کر دیا کہ فلاں جگہ ایک قبرستان نمودار ہوا ہے اور ایک بزرگ کی قبر بھی ———

دیکھتے ہی دیکھتے لوگ جمع ہو گئے، پھول والے، اگر بتی والے، سب ہی آ گئے، چادریں چڑھنے لگیں، قوالیاں ہونے لگیں، حال پہ حال آنے لگے ——— غرض اس سنسان گھر کی قسمت جاگ اٹھی اور وہ رونق ہو گئی کہ بس دیکھا کیجئے۔

۳۔ یاد آیا اجمیر شریف میں عرس شریف کے موقع پر وہ کچھ ہوتا تھا جو دیدنی تھا، زائرین کا بے پناہ ہجوم ہوتا تھا، مجاورین کے وارے نیارے ہوتے تھے، آس پاس دور پر سے بہت سی قبریں تھیں ——— مجاورین سب کو لے لے کر بلیڈ جاتے تھے، ایک من چلے مجاور نے کیا کام کیا، ایک قبر کے اندر جا بیٹھا، سرہانے سوراخ کر لیا تاکہ ہوا بھی جاتی رہے اور کام بھی ہوتا رہے، اس کا رفیق اس کی قبر کی مجاوری کے لئے مستعد تھا، جو آتا اس سے کہتا آؤ حضرت صاحب سے مصافحہ کرا دیں ——— زائرین ڈرتے ڈرتے سوراخ میں ہاتھ ڈالتے، خوب مصالحے ہوتے، خوش خوش ہاتھ باہر نکالتے اور اپنی قسمت پر ناز کرتے ——— عورتیں بھی آتیں، مصافحہ کے لئے وہ بھی ہاتھ ڈالتیں، مصافحہ تو ہو جاتا مگر سونے کی چوڑیاں اور انگوٹھیاں نذرِ مصافحہ ہو جاتی تھیں ——— چیختی چلاتی ہاتھ باہر نکالتیں، مجاور یہ کہہ کر خاموش کرتا کہ تم خوش نصیب ہو کہ حضرت صاحب نے تمہاری چوڑیاں اور انگوٹھیاں قبول فرما لیں، یہ رونے کا مقام نہیں یہ تو مقامِ مسرت ہے۔

۴۔ دہلی میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ کے مزار مبارک پر جانا ہوا، وہاں یہ رنگ دیکھا کہ ایک مجاور مزار شریف کے پائنتی بیٹھا ہے جو زائر آتا ہے اس سے مندرجہ ذیل چڑھاوے وصول کرتا ہے:۔

ا: پانچ آنے۔

ب: پھولوں کا دونا۔

ج: گلاب کا پوا۔

ان اشیاء ثلاثہ میں سے کسی کے پاس ایک چیز نہ ہوتی اسی وقت بغیر فاتحہ پڑھے

واپس کر دیا جاتا ——— پھر لطف کی بات یہ تھی کہ درگاہ شریف کے دروازے پر چادر موصوف کے ایک رفیق پھول اور گلاب فروخت کر رہے تھے ——— ادھر فروخت کرتے، ادھر چڑھتا اور فوراً ہی چوری چھپے یہاں آجاتا، گویا یہ پھول اور یہ گلاب بار بار بکتا اور بار بار چڑھتا ؎

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

۵۔ اور یہ منظر بھی دیکھنے میں آئے ——— دہلی کی ایک مشہور درگاہ میں جہاں علامہ اقبال نے بھی حاضری دی تھی، بمبئی سے چند عقیدت مند آئے، نہایت قیمتی مخملی چادر لائے، زردوزی کے کام سے سجی ہوئی چادر چڑھائی، فاتحہ کے لئے کھڑے ہو گئے ——— مجاورین کے متحارب گروپ اخانقاہوں اور مزارات پر اکثر متحارب گروپ نظر آئیں گے، شکرے کی طرح اس چادر کو تاڑتے رہے ——— جونہی وہ حضرات فاتحہ سے فارغ ہو کر چلے یہ سب کے سب لپکے، دونوں کے ہاتھ چادر کا ایک ایک سرا لگ گیا، کھینچا تانی شروع کر دی، چادر تار تار ہو گئی، جو ٹکڑا جس کے ہاتھ لگا لے گیا ؎

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر ہاتھ میں لے لے مینا اسی کا ہے

اللہ اللہ وہ اہل اللہ جنہوں نے تہذیب و شائستگی کا درس دیا، جنہوں نے لطفِ زندگی سے آشنا کیا اور جینا و مرنا سکھایا، ان کے مقابر آج بد تہذیبی اور خرافات کے گہوارے بن چکے ہیں ——— کاش ہماری آنکھیں کھل جائیں اور روحانیت کے ان مراکز میں مادہ پرستانہ ذہنیت کو چھوڑ کر ان حضرات کی روحانیت سے مستفیض ہوں ؎

دربارِ شہنشی سے خوش تر
مردانِ خدا کا آستانہ

اہلِ ظاہر صرف ظاہری ٹیپ ٹاپ پر مرتے ہیں، ان کے خیالِ خام میں عمارت

جنتیں اونچی ہوں گی، صاحبِ قبر بھی اتنے ہی اونچے ہوں گے حالانکہ ان حضرات کو اس ظاہری اونچ نیچ سے کوئی سروکار نہیں، یہ صرف ہمارے لئے جنت نظارہ ہے ——— ان کی جنت اور ہے، وہ اس مقامِ رفیع پر فائز ہیں جہاں سے انہیں کوئی نہیں اُتار سکتا۔

سازو آواز

ایک وہ زمانہ تھا کہ فضائیں پُرسکون، شہر و دیار پُرسکون، آسمان پُرسکون، زمیں پُرسکوں، جدھر دیکھو سکون ہی سکون، خاموشی ہی خاموشی ——— آہ! وہ سکون کہاں گیا اور وہ خاموشی کیا ہوئی؟ ——— اب جدھر دیکھو آوازیں ہی آوازیں، ہنگامے ہی ہنگامے ——— حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چشمِ بصیرت سے آنے والے ان ہنگاموں کو دیکھ لیا تھا اور فرما دیا تھا کہ وہ زمانہ آنے والا ہے جب فضاؤں سے نغمے پھوٹیں گے ——— دنیا حیران تھی، لیکن منتظر تھی ——— وہ دَور آگیا اور گردشِ دوراں نے بصیرتِ جنابِ رسالت مآب کی تصدیق کر دی ——— اللہ اللہ! زمانہ قوالِ محمدیہ کا سب سے بڑا مؤید ہے ——— اس تائید و تصدیق سے بڑھ کر اور کس کی تصدیق چاہیئے؟ ع

بتاں صفت تیغ دو پیکر نظر اس کی

ماہرین کا خیال ہے کہ آوازیں انسانی صحت پر بے حد اثر انداز ہوتی ہیں، جاگتے، سوتے، چلتے پھرتے، ہر وقت اثر انداز ہوتی ہیں، ہم کو احساس نہیں ہوتا لیکن آوازیں ہمارے تعاقب میں رہتی ہیں ——— واقعی کچھ محسوس تو یہی ہوتا ہے، ان صداؤں نے ٹکرا ٹکرا کر ہماری قوتِ حافظہ کو تقریباً زائل کر دیا ——— وہ انسان تحقیق کے میدان میں جس نے آسمان کے تارے توڑے ہیں، قوتِ حافظہ کھو بیٹھا ——— جس کو دیکھو تقریر پڑھ رہا ہے اور تقریر کرنا عجائبات میں شمار ہونے لگا ——— آئے دورِ جہالت کی پرسکون اور پرسکوت فضاؤں میں چلیں۔

یہاں عجیب عالم ہے، ایک ایک شاعر کو پورے کا پورا دیوان حفظ ہے اور

اور اس سے بھی زیادہ نہ معلوم کیا کچھ یاد ہے ——— لکھنا پڑھنا عیب ہے، اس لئے نہیں کہ علم سے دل اچاٹ ہے بلکہ اس لئے کہ بلند ہمت، قوتِ حافظہ کے لئے لکھنا پڑھنا باعثِ عار سمجھتے ہیں اور اُس شخص کو اچھی نظر نہیں دیکھتے جو خیالات کو تحریر کے سہارے محفوظ رکھتا ہے ——— قوتِ حافظہ کا یہ عالم ہے کہ جو بات سنتے ہیں، یاد کر لیتے ہیں، جو کہتے ہیں یاد ہوتا ہے، بھول چوک کا سوال ہی نہیں ——— چودہ سو برس گزر جانے کے بعد یہ محیر العقول قوتِ حافظہ تقریباً جان بلب ہے۔ زوالِ حافظہ کے اور سبب بھی ہو سکتے ہیں لیکن بیسویں صدی میں اس اچانک زوال میں ساز و آواز کا بڑا ہاتھ ہے جب ہی تو قرآنِ کریم نے انسانوں کو ہدایت کی کہ آہستہ بولا کرو، چلا چلا کر نہ بولا کرو ——— یہ بات قرآن نے کہی جو مذہبی سمجھ کر نظر انداز کر دی گئی ہے لیکن دورِ جدید کی تحقیق نے ثابت کر دیا کہ قرآن کی یہ بات سائنٹیفک بھی ہے، یعنی چلا کر بولنے سے آوازوں کے تصادمات قوتِ حافظہ اور صحت کو متاثر کرتے ہیں ——— اسی لئے دربارِ نبوی میں حاضرین کو خاموش اور سراپا گوش بنایا گیا کہ اس مجلس میں جو کچھ بتایا جاتا تھا، یاد رکھنے کے لئے، دل میں اتارنے کے لئے سینے سے لگانے کے لئے ———

اگر اب بھی کچھ شک ہو تو ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ دیہاتیوں کی قوتِ حافظہ، شہریوں کی قوتِ حافظہ سے کہیں زیادہ ہوتی ہے ——— آخر کیوں؟ کیا بات ہے؟ ——— وہاں آوازیں اور ہنگامے نہیں اور یہاں آوازیں ہی آوازیں ہیں، ہر آواز ہمارے ذہنی خزانوں کو غیر شعوری طور پر لوٹ رہی ہے اور ہمیں خبر تک نہیں ——— قوتِ حافظہ کے اسی زوال نے ہمارے علمی اداروں میں امتحانات کو (جن کا تمام تر دار و مدار قوتِ حافظہ پر ہوتا ہے) نہایت مشکل بنا دیا ہے ——— استاد پہلے بھی تھے، اب بھی ہیں ——— امتحان پہلے بھی ہوتے تھے، اب بھی ہوتے ہیں مگر اس امتحان کے لئے جو خفیہ انتظامات ہوتے ہیں وہ پہلے نہ ہوتے تھے اور اس پر بھی طالب علم کمرۂ امتحان میں اپنے 'انتظامات'

الگ کرتا ہے، وہ زوالِ حافظہ کی وجہ سے غریقِ دریا کی طرح اِدھر اُدھر ہاتھ مارتا ہے ——— ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ——— اسی مشکل کی وجہ سے مغربی ملکوں میں طریقۂ امتحانات یکسر بدل دیا گیا ہے اور قوتِ حافظہ پر کم سے کم بار رکھا گیا ہے اور رکھا جانا چاہیئے ——— یہ تو علم ہو گا کہ ایک طرف تو ہم ساز و آواز سے طالب علم کی قوتِ حافظہ پر شبخون ماریں اور دوسری طرف اس سے وہی متاعِ گم گشتہ طلب کریں۔

آوازوں کی دنیا میں نہ کوئی عبقری پروان چڑھا اور نہ کوئی شے کچھ بن کر اُبھری ——— ہر عبقری اور ہر شے خاموش فضاؤں کی پروردہ ہے ——— غارِ حرا کی پرسکون پرسکوت فضاؤں سے حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم آفتابِ عالمتاب بن کر جلوہ گر ہوئے ——— دریا کی خاموش گہرائیوں میں قطرۂ بے مایہ سینۂ صدف سے گوہرِ آبدار بن کر ابھرا ——— سینۂ گیتی کی خاموش فضاؤں میں تخمِ فرومایہ نئی قوت لے کر نکلا ——— شکمِ مادر کی پرسکوت فضاؤں میں حضرتِ انسان نے زندگی پائی اور ایک نئی آن بان کے ساتھ ظاہر ہوئے ——— غرض تعمیر و تشکیل اور ترقی کے لیے سکون و سکوت کی ضرورت ہے لیکن آج ہر چیز میسر ہے، یہی نہیں ؎

کہتے ہیں جسے سکوں، نہیں ہے

سکوت و خاموشی

خاموشی شکمِ مادر بھی ہے اور سینۂ گیتی بھی، سب ساز اس سے نکلتے ہیں اور پھر اسی میں گم ہو جاتے ہیں ——— پھر وہی خاموشی، وہی سکوت کا عالم ——— لیکن یہ خاموشی کہ ساز و آواز سے بیگانہ نظر آتی ہے مگر ساز و آواز سے معمور ہے، 'ہنگامۂ خاموش' کا نام سکوت ہے ——— دورِ جدید کی ایجادات نے اس عقدے کو حل کر کے رکھ دیا، فضائے خاموش میں ریڈیو کھولئے اور پھر دیکھئے کیسا بولتا ہے ——— یہ بول کہاں سے آ گئے؟ ——— یہ اچانک کیسا ہنگامہ برپا ہو گیا؟ ——— اسی خاموشی نے ان ہنگاموں کو

جنم دیا ہے ——— خاموشی کے اس راز کو سب سے پہلے ایک مسلم صوفی اور فلسفی محی الدین ابن عربی علیہ الرحمۃ نے پایا تھا، یہ ساتویں صدی ہجری میں گزرے ہیں ——— آج سے سات سو برس پہلے ——— مگر ان کی بصیرت تو دیکھو کہ وہ بات کہہ گئے جو صدیوں بعد دریافت کی گئی ——— سنئے وہ کیا بات کہہ گئے :-

" اما الحروف اللفظیۃ فانہا تتشکل فی الھواء ولھذا تتصل بالسمع علی صورۃ ما نطق بہا المتکلم فاذا تشکلت فی الھواء قامت بہا ارواحہا وھذہ الحروف لا یزال الھواء یمسک علیہا شکلہا وھذہ الحروف الھوائیۃ اللفظیۃ لا یدرکہ الموت بعد وجودھا بخلاف الحروف الرقیمۃ تقبل التغیر والزوال لانہا فی محل تقبل ذلک والاشکال اللفظیۃ فی محل لا یقبل ذلک ولھذا کان لہا البقاء فالجو کلہ مملو من کلام العالم یراہ صاحب الکشف صورۃ قائمۃ " (فتوحات مکیہ ج ۱، ص ۱۹۱)

(ترجمہ) لیکن لفظی حروف فضا میں صورت پذیر ہوتے ہیں اسی لئے بولنے والا جس طرح بولتا ہے اسی طرح یہ کانوں سے ٹکراتے ہیں ——— جب یہ فضا میں صورت پذیر ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ ان کی روحیں بھی فضا میں ٹھہر جاتی ہیں ——— یہی وہ حروف ہیں جو جیسی صورتیں اختیار کر لیتے ہیں فضائیں ان کو زائل نہیں کرتیں ——— صورت پذیر ہونے کے بعد ان خلائی اور لفظی حروف کو موت نہیں چھوتی برخلاف ان حروف کے جو کاغذ پر لکھے جاتے ہیں، ان میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ثابت نہیں رہتے کیونکہ وہ ایسی جگہ ہوتے ہیں جہاں تبدیلی اور بے ثباتی ہے ——— لفظی صورتیں ایسی جگہ نہیں جہاں تبدیلی اور بے ثباتی ہو اس لئے یہ حروف خلا میں باقی رہتے

ہیں —— وہ خلا، جو اہلِ عالم کی باتوں سے سب کا سب اٹا پڑا ہے ——
صاحبِ کشف (فضائے بسیط میں) حروف کی ان ٹھہری ہوئی صورتوں کو
دیکھتا ہے۔"

دیکھا آپ نے! سات سو برس پہلے ایک ہسپانوی صوفی جو بات کہہ گیا، صدیوں بعد مغربی مفکرین وہاں تک پہنچے —— یا اِس تحریر نے ان کی رہنمائی کی کیونکہ ان لوگوں کی عادت ہے، چُراتے ہیں؛ بتاتے نہیں —— ہم بے خبر ہیں، انہی کی سمجھتے ہیں —— باخبر ہوتے تو ان کی چوریوں کا حال معلوم ہوتا اور پھر دل بزبانِ حال پکار اٹھتا ع

چہ دلاور ست دزدے کہ بکف چراغ دارد!

سائنس اور آرٹس

کہتے ہیں سائنس کا دور ہے، سائنس کے مضامین کی ضرورت ہے، آرٹس کے مضامین پرانے ہو چکے —— بہت خوب! —— لیکن نوعِ انسان کے سامنے صرف اقتصادی اور معاشی مسائل نہیں، اس سے بڑھ کر اور مسائل بھی ہیں —— اخلاقی، روحانی اور سیاسی مسائل۔ دورِ جدید کو ان مسائل کا سامنا ہے، حل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی —— کبھی غور کیا کہ اتنے سارے مسائل کا ڈھیر کیوں لگ گیا، یہ دنیا سراپا مسئلہ کیوں بن گئی؟ —— جہاں اور اسباب ہیں وہاں سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے اُن علوم و فنون سے آنکھیں بند کرلیں جو ان مسائل کو حل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں —— میں تو یہ کہوں گا کہ دورِ جدید کو آج ان مضامین کی جس قدر ضرورت ہے پہلے کبھی نہ ہوئی ہوگی —— سائنس ایک عظیم قوت حاصل کرلیتی ہے لیکن اس قوت کا صحیح استعمال سائنس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے —— یہ اس کے بس کی بات نہیں۔

ایک دکھی دل غموں سے چور بیٹھا ہے، دل مضطرب و بیقرار ہے —— آنکھیں اشکبار ہیں —— سکون کا متلاشی ہے، سکون نہیں ملتا —— کسی کہنے والے

نے کہا کہ اس کو ایر کنڈیشنڈ کمروں میں بٹھاؤ، موٹروں میں پھراؤ، جہاز وں پر اڑاؤ ——— شاید دل بہل جائے ——— افسوس یہ کیسا علاج تجویز کیا ——— وہ دل پکڑے بیٹھا ہے، اس کا دل سنبھالو! سائنس عاجز ہے ——— اس کے پاس دوائے دردِ دل نہیں ——— تو پھر کہاں جائیں؟

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب!!

ہوشیار، خبردار! اطمینان و سکونِ قلب اللہ ہی کے ذکر و فکر میں ہے ——— مگر یہ تو سائنس نہیں، نہ سہی، مداوائے دل یہی ہے۔ اب ہمیں سائنس کی ضرورت نہیں، دوائے دل کی ضرورت ہے۔

جب ظالم، مظلوم پر چڑھ دوڑتا ہے ——— جب سرمایہ دار حرام و ناجائز ذرائع سے غریبوں کا خون چوستا ہے ——— جب کمینے اور اوباش دامنِ عزت تار تار کرتے ہیں ——— جب جہاں، دیوانوں کی طرح تخریب کاری پر کمربستہ ہو جاتے ہیں ——— جب دنیا کے سیاست داں عالمی مسائل کو سلجھانے کے لئے سر جوڑ کے بیٹھتے ہیں ——— تو بتاؤ کونسی سائنس ہمارے کام آتی ہے؟ ——— اسی لئے تو اقبالؔ نے کہا تھا ؎

تقدیرِ امم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

ہمارے بہت سے مسائل کا تعلق روحانیت و اخلاق سے ہے ——— سائنس کو ان سے کوئی سروکار نہیں ——— اسی لئے جب تک سائنس کے مضامین کے ساتھ ساتھ آرٹس کے مضامین کی تعلیم نہ دی جائے گی تیر میں پریشان رہ جائیں گی، انسان نہ بنیں گے ——— صرف سائنس دہشت کو جنم دیتی ہے، آرٹس کے مضامین اس دہشت کو ذرا نرما دیتے ہیں، ہمیں گرمی و نرمی دونوں کی ضرورت ہے۔

اور ہاں ذرا اس حقیقت کی طرف تو نظر کیجئے، سائنس کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود کوئی سائنسدان قومی راہنما اور عالمی حکمراں بن کر نہیں ابھرا ——— کارِ جہانبانی کے لئے سائنس کی نہیں آرٹس کی ضرورت ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں دنیا اتنی پیچھے نہ تھی ——— اگر آپ چاہتے تو مدینہ شریف میں مختلف صنعتیں قائم ہو سکتی تھیں ——— مشینی صنعتیں نہ سہی، گھریلو صنعتیں ہی سہی، مگر آپ نے تمام صنعتوں کو چھوڑ کر ایک صنعت قائم کی اور وہ دل سازی کی صنعت تھی۔

لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولا یتلو علیھم اٰیتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل سے معقولات پر منقولات کی فوقیت واضح ہو جاتی ہے ——— 'دل سازی' کی صنعت وہ ہے جس سے موت نہیں، زندگی ملتی ہے اور وہ بھی جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ——— سائنس کو دیکھو تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے بنی نوعِ انسان پر موت مسلط کر دی ہے ——— ہر شخص سہما سہما نظر آتا ہے ——— آن کی آن میں لاکھوں فنا ہو سکتے ہیں ——— مگر موت کی اس ارزانی میں، زندگی بہت گراں ہے ——— زندہ رکھنے کے کچھ سامان تو فراہم کئے جائیں ——— مگر موت کا وہ اہتمام کیا ہے کہ باید و شاید ؎

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

حجاب و بے حجابی

بے حجابی نے یہیں کہیں کا نہ رکھا ——— ہمارے فکر و شعور پر صنفِ نازک مسلط ہو چکی ہے ——— ایک عرصہ پہلے اقبال نے کہا تھا ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ ان بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

لیکن اب تو وہ ہر شخص کی راکب ہے ــــــــ تاریخ گواہ ہے جو معاشرہ بے حجابی کا شکار ہو جاتا ہے وہ کہیں کا نہیں رہتا ــــــــ اس بے حجابی نے قوموں کو تباہ و برباد کر دیا ہے، یہ میں نہیں کہہ رہا دورِ جدید کا مشہور مؤرخ ٹوئنبی کہہ رہا ہے ــــــــ وہ کہتا ہے ــــــــ "میں نے تاریخ کو پڑھا ہے اور پرکھا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اقوامِ عالم اس وقت تباہ و برباد ہوئی ہیں، جب ان کی عورتیں بے حجابانہ باہر نکلی ہیں"

ذرا غور تو کیجئے کہ عہدِ نبوی میں جب کہ ہر مسلمان پروردۂ مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) تھا، نیک و پارسا تھا، ایسے پاک و صاف معاشرے میں بھی حجاب کی پابندیاں لگائی گئیں ــــــــ آخر کیوں! ــــــــ کوئی تو حکمت ہوگی ــــــــ مگر ہم ان تمام شرعی حکمتوں کو بالائے طاق رکھ کر میدان میں آگئے ؏

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا

پاکستان اس لئے بنایا تھا کہ ہم یہاں حدود اللہ کی پاسداری کریں گے لیکن ہم نے کیا کیا؟ ؏

آنچہ ما کردیم برخود ہیچ نابینا نہ کرد

آیئے ذرا ماضی کی طرف چلیں ــــــــ پہلے کیا تھے اور اب کیا ہو گئے، ذرا دیکھیں! ــــــــ ایک وہ زمانہ تھا جب خاتونِ خانہ سہاگ کی پری نہ تھی ــــــــ ڈولی میں جایا کرتی تھی، بغیر برقعے گھر سے نہ سرکتی تھی، زینے سے جب اترتی دروازے پر ڈولی لگا دی جاتی، اور اس پر بھی بس نہیں چاروں طرف پردہ لگا دیا جاتا، گلی کا سارا ٹریفک رک جاتا، ہندو، سکھ، عیسائی غرض جو بھی گلی سے گزرتا ہوتا، منہ پھیر کے کھڑا ہو جاتا

جب یہ نازنوں کی پالی ہزار نخروں سے ڈولی میں بیٹھتی ——— اور کہاروں کے دوش پر کوچہ و بازار سے اس طرح گزرتی جیسے کوئی شاہی سواری گزر رہی ہے ——— کہار ہٹو بچو! کی صدائیں بلند کرتے چلتے اور سب لوگ پرے پرے ہٹتے جاتے ——— یہ دہلی کی بات کر رہا ہوں لیکن اسلامی تہذیب کے گہواروں میں قریب قریب یہی کچھ ہوتا تھا مگر اب یہ سب باتیں ؎

نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

یہ بات اس وقت کی ہے جب پاکستان کی تحریک زوروں پر تھی، خدا سے وعدے کئے جا رہے تھے لیکن اب جب وعدہ پورا ہو چکا ہے ——— اپنے عہد سے پھر گئے، بدعہدی پر اتر آئے، اور وہ کچھ کیا کہ دنیا کے کسی عہد شکن نے نہ کیا ہوگا ——— برقعے پھینک دئے، دوپٹے اتار دئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ——— سڑکوں اور بازاروں میں بے حجابانہ چلتی ہیں ——— یوں محسوس ہوتا ہے کہ دامِ صیاد سے مرغِ اسیر نکل بھاگا ہے ——— اور پھر ٹی وی ملاحظہ فرمائیں تو عجب بہار نظر آتی ہے، شرم و ندامت سے سر جھک جاتا ہے ——— اللہ اللہ! اگر ہمارے اکابرین و اسلاف تھوڑی دیر کے لئے پھر زندہ کر دئے جائیں اور یہ مناظر دیکھیں تو دل دھک سے ہو جائے، ایسی آہ نکلے کہ کلیجہ پکڑ کے رہ جائیں اور پھر نہ اٹھ پائیں۔

منزل بمنزل وجود سے ظہور تک، ظہور سے حضور تک، حضور سے شہود تک اور شہود سے قصور تک منزل بمنزل کاروانِ حیات چلتا چلا جا رہا ہے ——— کوتاہ نظری تو دیکھو کہ انسان نے منزلِ ظہور کو پہلی اور آخری منزل سمجھ لیا ہے اور ساری منزلوں سے بے پروا ہو کر مست و بے خود ہو گیا ہے ؎

نہ ادراکِ ہستی نہ احساسِ ہستی
جدھر چل پڑا ہوں چلا جا رہا ہوں

حیات و موت سے کس کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ ——— وہ کیا ہے؟ ——— ناگفتنی ہے ——— خلق الموت والحیٰوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا (ترجمہ) موت و حیات کو اس لئے پیدا کیا گیا تاکہ تمہارا امتحان لیا جائے کہ تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے۔"

معلوم ہوا کہ موت و حیات ذرائع ہیں، مقصود بالذات نہیں، مقصود بالذات کچھ اور ہی ہے ——— لیکن یہ "تم" کیا ہے جس کا امتحان لیا جا رہا ہے؟ کیا موت و حیات سے ماوراء ہے ——— ہاں یہ وہی ہے جس سے اس کے مولیٰ نے عہد لیا تھا اور پوچھا تھا کہ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" ——— اس نے کہا تھا ——— "ہاں ہاں تو ہی ہمارا رب ہے" ——— آج اس عہد کی آزمائش ہے ——— بغیر آزمائش محبت و عشق کا اندازہ ہو نہیں سکتا ——— زندگی کیا ہے؟ آزمائش عشق و محبت ہے ——— اور ہاں پھر نہ یہ موت ہوگی اور نہ یہ زندگی ——— یہ تو ذرائع تھے امتحان کے بعد ذرائع کی پوچھ نہیں ہوتی ——— تو پھر کیا ہوگا؟ ——— زندگی ہوگی ——— لیکن خدا جانے کیسی زندگی ہوگی؟

نظروں کے سامنے جو کچھ ہوتا ہے تشبیہ اسی سے دی جاتی ہے ——— انجانی چیزوں سے نہیں دی جاتی کہ ایسی تشبیہ مہمل ہوتی ہے ——— ہاں تو جانی پہچانی چیزوں سے اس لئے تشبیہ دی جاتی ہے کہ ان دیکھی چیزیں نظر آنے لگیں۔ ان جانی چیزیں سمجھ میں آنے لگیں ——— جنت میں کیا کچھ نہ ہوگا لیکن خدا نے انہیں چیزوں کا ذکر فرمایا اور انہیں چیزوں کو بیان فرمایا جو جانی پہچانی تھیں تاکہ حقیقت سے کچھ قربت ہو جائے ——— مگر ان اشیاء کی حقیقتیں تشبیہ سے بالاتر ہیں ——— یہ سمجھ لیا کہ ویسے ہی پھل ہوں گے جیسے ہم کھاتے ہیں، ایسی ہی نہریں اور باغات ہوں گے جیسی ہم دیکھ رہے تھے یا ایسے ہی فرش و فروش اور ظروف ہوں گے جیسے ہم استعمال کر رہے ہیں۔

سخت نادانی ہے۔

ایک دیہاتی نہیں جانتا کہ ریڈیو کیا ہے اور ٹیلیویژن کسے کہتے ہیں ——— آپ سے پوچھتا ہے ——— آپ فرماتے ہیں کہ ریڈیو ایک قسم کا ڈبہ ہے جس میں سے آوازیں نکلتی ہیں اور ٹیلیویژن بھی ایک قسم کا ڈبہ ہے جس کے آگے شیشہ لگا ہوتا ہے، اس میں سے آوازیں بھی نکلتی ہیں اور صورتیں بھی نظر آتی ہیں ——— لیکن کیا اس بیان اور تشبیہ سے ریڈیو اور ٹیلیویژن کا حق ادا ہو گیا؟ ——— ہرگز نہیں، تشبیہ سے حقیقت کو کوئی علاقہ اور نسبت نہیں ——— ٹھیک اسی طرح خدا نے جن جن باتوں کا ذکر فرمایا ہے اور جن جن چیزوں کو گنایا ہے اور تشبیہ دے دے کے سمجھایا ہے ان کی حقیقتوں کا ادراک تو اسی وقت ہوگا جب ان حقائق سے واقف ہوں گے۔

بات زندگی کی تھی کہاں سے کہاں نکل گیا ——— عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ اس دنیوی موت و حیات کے بعد آنے والی زندگی، حیاتِ دنیوی سے قطعاً مختلف ہوگی، وہ زندگی موت کی زد سے باہر ہوگی پھر ایسی زندگی کہاں ہو سکتی ہے؟ ——— لیکن چونکہ ہم اسی زندگی سے واقف ہیں اس لئے جب خدا زندگی کا ذکر کرتا ہے تو اپنی تنگ دامانی کی وجہ سے ایسی ہی زندگی سمجھ بیٹھتے ہیں جیسی ہم گزار رہے ہیں ——— مگر زندگی ایک جیسی نہیں مگر ایک ہے۔

باری باری

باری باری سب چلے جا رہے ہیں ——— دل ہے کہ غم میں ڈوبا چلا جا رہا ہے ؎

سماں رہ رہ کے آتا ہے یاد
ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا!

یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو سہارا دے رہا ہے ——— اور سب منزل کی طرف رواں دواں ہیں ——— کل کسی کو ہم نے کندھا دیا تھا، آج ہم کو کندھا

دیا جا رہا ہے اور کل ان کو کندھا دیا جائے گا جنہوں نے آج ہم کو کندھا دیا ہے ——— کل کسی کی تربت پہ ہم مٹی ڈال رہے تھے، آج ہماری تربت پہ مٹی ڈالی جا رہی ہے اور کل ان کی تربت پہ ڈالی جائے گی جو آج ہماری تربت پہ ڈال رہے ہیں ——— اللہ اللہ یہ دنیا کیسا عبرتکدہ ہے! ؎

آہ! معلوم نہیں ساتھ سے اپنے شب و روز
لوگ جاتے ہیں چلے سو یہ کدھر جاتے ہیں!

ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو ختم ہونے پر نہیں آتا ——— حیف ہماری بہاریں بھی خزاں بداماں ہیں، ہاں ؎

زبانِ برگِ گل سے پوچھ کیا ارشاد ہوتا ہے!

زندگی جوں جوں آگے بڑھتی جاتی ہے ہنگامناک ہوتی جاتی ہے ——— جن کو ہم نے اپنی آنکھوں کے سامنے ہنستا بولتا دیکھا تھا، وہ اب آنکھوں سے اوجھل ہو چکے ہیں ——— کوئی دم میں ہم بھی اوجھل ہو جائیں گے ——— جانے والوں کا غم ایک طرف اور ان کے علم و فضل کا ماتم ایک طرف ——— ایک وہ ہیں جن کا جانا صرف اُن کا جانا ہے اور ایک وہ ہیں اُن کا جانا صرف ان کا جانا نہیں بلکہ عالم کا اٹھ جانا ہے موت العالم موت العالم ——— ابتدا سے اِن مرحومین کا شمار کروں تو شمار کرتے کرتے تھک جاؤں ——— نہ معلوم کتنے دلوں کا یہ حال ہوگا ——— جوں جوں آگے بڑھتے جاتے ہیں دل پر داغ پڑتے جاتے ہیں ——— بیشک داغوں کی پرورش دل ہی کے بس کی بات ہے اور یہ اسی کی ہمت ہے جو یہ کہتا ہے ؎

رنج، راحت ہے، سکوں غمِ ہجراں کی قسم
یادِ جاناں کی قسم، جلوۂ جاناں کی قسم

سادگی و بے نیازی

سادگی اور بے نیازی کا چولی دامن کا ساتھ ہے ——— جو سادہ مزاج ہوگا، بے نیاز بھی ہوگا ——— تکلف انسان کو نیازمند بنا کر قعرِ ذلت میں گرا دیتا ہے ——— اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"سادگی ایمان کی نشانی ہے"

جس کی زندگی میں سادگی نہیں اس کی زندگی ایمان کی بھی حلاوت سے محروم ہے ——— ایک طرف سادگی کی نشانی بتائی اور دوسری طرف سے ٹھاٹ باٹ کی زندگی سے دور رکھنے کے لئے فرمایا کہ :

"سوال ذلت ہے اگرچہ والدین ہی سے کیوں نہ کیا جائے۔"

آپ نے دیکھا کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس بے نیازی کا سبق سکھایا ہے ——— لیکن یہ دونوں سبق بھلا دئے گئے ——— ہم کیسے بے نیاز تھے، مگر اب کیسے نیازمند ہو گئے ——— اس نیازمندی نے ہم کو کہیں کا نہ رکھا ——— مدنی آقا نے جو نسخہ بتایا تھا اس پر دہریوں اور غیر مسلموں نے عمل کیا اور پھل پایا ——— جس طرح عالمِ نباتات میں جڑی بوٹیاں یکساں طور پر کافر و مسلم سب کے لئے مفید ہیں اس طرح علم و حکمت کے یہ نسخے بھی یکساں طور پر سب کے لئے مفید ہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ کافر عمل کرے تو تاثیر الٹا اثر دکھائے اور مسلمان عمل کرے تو فائدہ ہی فائدہ ——— ہم خود دیکھ رہے ہیں کہ اس سادگی اور بے نیازی پر ایک پڑوسی ملک نے عمل کیا اور وہ عمر میں ہم سے چھوٹا ہوتے ہوئے بھی کہاں سے کہاں پہنچ گیا کہ اب لوگ اس کے آگے ہاتھ پھیلا رہے ہیں ——— اِس ملک نے حیرت انگیز ترقی کیوں کی ؟ ——— ہاں آزادی ملنے کے بعد عہد کیا تھا کہ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں گے، خود جو کچھ بن پڑے گا کریں گے" ——— اُس نے انسان کو دنیا کی عظیم ترین دولت سمجھا اور اس دولت کے ذریعہ وہ ترقی کی کہ اس کو دولت نہ سمجھنے والے نادم و شرمسار ہیں ——— کاش انسان کو ہم بھی اتنا ہی عظیم سمجھیں اور

وہ خود اعتمادی پیدا کریں کہ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں! ـــــــ لیکن ہم کو تو مانگنے کی لت ایسی پڑی ہے کہ بظاہر یہ لت چھٹتی نظر نہیں آتی، مگر اس سے جتنی جلد چھٹکارا حاصل کر لیا جائے اچھا ہی ہے کیونکہ مانگنے کی لت معاشرے کی اقتصادی حالت کو اس طرح تباہ کر دیتی ہے جس طرح لکڑی کو گھن لگ جاتا ہے یا کتاب کو دیمک کھا جاتی ہے ـــــــ اور افراد کو چین نہیں ملتا ـــــــ چین کہاں سے ملے جب بوٹی بوٹی مقروض ہو!

جب تک سادگی دل میں گھر نہیں کرتی، قوم خوشحال نہیں ہو سکتی ـــــــ سادگی سے تجاوز ہی انسان کو طلب و سوال پر مجبور کرتا ہے اور جب ایک مرتبہ ہاتھ پھیل جاتا ہے تو پھر پھیلتا ہی چلا جاتا ہے ـــــــ ہم حال سے بے حال ہیں لیکن پھر بھی حال یہ ہے کہ شاندار عمارتیں، زرق برق لباس، لمبی لمبی کاریں ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہیں ـــــــ عورتوں کی رنگین مزاجی نے تو رہی سہی کسر پوری کر دی ـــــــ ایک زمانہ تھا کہ کپڑے برسوں رکھے رہتے لیکن پھر بھی پہننے کے قابل ہوتے لیکن ایک یہ زمانہ ہے کہ فیشن کی برق رفتاری نے خود فیشن پرستوں کو حیران و پریشان کر رکھا ہے ـــــــ کپڑوں کے ڈیزائن ہی نہیں، تراش خراش میں صبح و شام تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ـــــــ جو آج پہنا ہے وہ کل پرانا ہو گیا ـــــــ یہ بھی ممکن ہے کہ آج ہی پرانا ہو جائے ـــــــ نہ معلوم کہ خدا نخواستہ خدا نے اس جنون و دیوانگی کی نذر ہو رہے ہیں اور حلال و حرام کی تمیز اٹھ چکی ہے!

لباس ہی نہیں، رہن سہن میں بھی بڑا تکلف ہے، کوٹھیوں اور بنگلوں کو جا کر دیکھئے ـــــــ کیا ٹھاٹھ ہے! دنیا میں جنت کے مزے لوٹ رہے ہیں ـــــــ یہ سب محمد رسول اللہ کے غلام ہیں جو پیوند لگے کپڑے پہنتے تھے، جو چٹائی پر سوتے تھے، جو زمین پر بیٹھتے تھے، جو کچے مکانوں میں رہتے تھے۔

طاقت وصداقت

دنیا نے طاقت کی حکمرانی و بالادستی کو تسلیم کیا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صداقت کی حکمرانی اور بالادستی کو تسلیم

کیا ——— یہ ایک عظیم کارنامہ ہے ——— طاقت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے مگر صداقت نہ گھٹتی ہے اور نہ بڑھتی ہے، وہ ناقابلِ تبدیل حقیقت ہے ——— یہ اسلامی صداقت ہے، یہ محمدی صداقت ہے، یہ الٰہی صداقت ہے، یہ کائناتی صداقت ہے ——— اور اہلِ دنیا کی صداقتوں کا عجیب حال ہے، یہ گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں بلکہ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ حق، باطل ہو جاتا ہے اور باطل، حق ——— وہی بات جسے آج باطل کہا جا رہا ہے، کل حق ہو جاتی ہے اور وہی بات جسے آج حق کہا جا رہا ہے، کل باطل ہو جاتی ہے ——— دنیا حیران ہے کہ کیا صداقتیں بھی بدلا کرتی ہیں؟ ——— نہیں ہرگز نہیں ——— جس کو ذرا سی سیاسی بصیرت حاصل ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ دورِ جدید میں صداقت کی تبدیلیاں طاقت کے توازن اور اس کے اتار چڑھاؤ پر مبنی ہیں ——— جب صداقت کی بات کی جاتی ہے، طاقت کی بات ضرور ہوتی ہے، حالانکہ نہ ہونی چاہئے، اسی وقت قوی سے ضعیف کا حق دلایا جا سکتا ہے ——— جب صداقت کی تائید کی جاتی ہے تو در پردہ یا تو طاقت کی تائید کی جاتی ہے یا خود غرضیوں کی ——— صداقت ایک بہانہ ہے، اصل مقصود کچھ اور ہی ہے، جبھی تو اقبال نے یہ چبھتا ہوا مصرعہ کہا تھا ؎

دیا استبداد جمہوری قبا میں ہے پائے کوب

مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی صداقت کی تعلیم دی جو تمام مصلحت اندیشیوں اور خود غرضیوں سے بے نیاز ہے ——— قرآنِ کریم نے صداقت شعاری کا یہ معیار رکھا ہے ——— اگر صداقت، دشمن کی طرف ہے اور باطل، دوست کی طرف تو بر ملا دشمن کی حمایت کرو بلکہ اگر عدل گستری میں والدین کے مقابلہ میں فیصلہ دشمن کے حق میں کرنا پڑ جائے تو بلا چون و چرا فیصلہ کر دو، ذرا نہ جھجکو ——— ایسی صداقت شعاری اور عدل گستری کے لئے جیتے کا جگر چاہئے لیکن حضرتِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیٹے کے خلاف فیصلہ فرما کر وہ روشن مثال قائم کر دی جو قیامت تک چمکتی رہے گی۔

اپنے لئے یا غیر کے لئے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "خیر الناس من ینفع الناس" ——— لوگوں میں اچھا وہی ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے ——— یعنی جو اپنا نہ ہو، سب کا ہو ؎

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

بلاشبہ انسانیت یہی ہے ورنہ اپنے لئے تو سب ہی کیا کرتے ہیں ——— یہ ایک حیوانی خوبی ہے ——— سارے حیوانات یہی کرتے ہیں ——— خود کھاتے پیتے ہیں اور اپنے بچوں کو کھلاتے پلاتے ہیں ——— اگر انسان ایسا کرتا ہے تو اس میں کیا خوبی ہے؟ ——— حیوانات میں ایسے بھی ملیں گے جو اپنا پیٹ پالتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے ساتھیوں کی بھی خبر رکھتے ہیں ——— چیونٹیوں میں دیکھو کیسا ایکا ہے ——— اتحاد و یگانگت کا یہ منظر تو روزانہ گھروں میں نظر آتا ہے ——— اللہ اللہ حیوانات کا یہ حال اور انسان کی خود غرضی کا یہ عالم کہ ایک دوسرے کو کھائے جا رہا ہے ؎

آدمی کا آدمی دشمن، خدا کی شان ہے!

اور اس خود پسندی اور خود غرضی پر وہ گھمنڈ جیسے وہ فاتحِ عالم ہے ——— لیکن ذرا غور تو کرو باوجود دنیا سمیٹنے کے وہ ابھی حیوانی منزل سے آگے نہیں بڑھا ——— بے شک اس نے محل بنایا، دولت جمع کی، کاروں پکاریں خریدیں ——— مگر یہ سب کچھ اپنے لئے ——— اور اگر صدقہ و خیرات کچھ دیا بھی تو آٹے میں نمک کے برابر اور اس پر بھی وہ غرور جیسے کسی پر زبردست احسان کیا ہو ———

——— لیکن آؤ آؤ ——— دیکھو دیکھو ——— سرزمینِ حجاز میں دو عالم کا بادشاہ فقیرانہ بیٹھا ہے ——— اس نے جو کیا دوسروں کے لئے کیا، اپنے لئے کچھ نہ کیا ——— اس کو جب تک چین نہیں آتا جب تک وہ اپنا مال و متاع اپنے غلاموں میں نہیں

دیتا ——— اُس نے قیامت تک اپنوں کے لئے صدقہ وخیرات اور زکوٰۃ کی راہ بند کردی اور یہ بتادیا کہ نوعِ انسان کے ساتھ اُس کا برتاؤ کتنا مخلصانہ تھا ——— اب دنیا کا کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنے لئے دنیا سمیٹنے کے لئے آیا تھا ——— نہیں نہیں ہرگز نہیں ——— قیامت تک اُس تہمت کا سدِ باب کر دیا گیا اور بدخواہوں کی زبانیں بند کر دی گئیں ——— اہلِ دنیا کیا حاکم، کیا محکوم جب دنیا سمیٹنے پر آتے ہیں تو ایک کو ایک کی خبر نہیں رہتی ——— یہ انسانی زندگی نہیں حیوانی زندگی ہے ——— ایثار و قربانی کی زندگی حقیقی زندگی ہے ——— لیکن ؎

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

تہمتِ بے تابی

رسولِ کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے صبر و استقلال کا وہ درس دیا کہ رہتی دنیا تک یادگار رہے گا ——— مکی زندگی کس مصیبت سے کٹی! ——— لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کس صبر و استقامت سے کاٹی! ——— ان کا کیا پوچھنا، ان کی تو بات ہی کچھ اور ہے ؎

بے مثالی کی وہ مثال ہے حسن
خوبیٔ یار کا جواب کہاں!

ان کے غلاموں کا حال پڑھئے تو عبرت ہو ——— قدم قدم پر صبر و استقلال کے چراغ روشن نظر آئیں گے ——— زندگی کا بڑے سے بڑا حادثہ بھی ان غلاموں کے پایۂ ثبات کو متزلزل نہ کر سکا ——— کانوں سنے اور آنکھوں دیکھے کچھ واقعات بطور مشاہدات عرض کرتا ہوں۔

سلسلۂ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ حضرت مجدد الفِ ثانی علیہ الرحمۃ کے تین ہونہار نوعمر نوجوان صاحبزادے طاعون کی وبا میں آن کی آن میں خدا کو پیارے ہو گئے ———

کوئی اور ہوتا تو دل پھٹ جاتا مگر دیکھو دیکھو اُس کو داستقامت سے کیا فرمایا :-

" یہ خدا کی امانت تھے، اس کا شکر و احسان ہے کہ یہ امانت بلا چون وچرا خوش دلی کے ساتھ اُس کے سپرد کر دی گئی "

اور سنئے! سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک اور بزرگ حضرت مفتی اعظم محمد مظہر اللہ علیہ الرحمہ (شاہی امام مسجد فتحپوری، دہلی) کے جواں سال، عالم و فاضل صاحبزادے خدا کو پیارے ہوئے ——— رونا دھونا کیسا، ذرا استقامت تو دیکھو کہ بیٹے کی لاش پر کھڑے فرماتے ہیں :-

" اے مولا! تو اپنے بندے کا امتحان لینا چاہتا ہے؟ ——— ہاں وہ تیری رضا پر راضی ہے، ہرگز ہرگز مضطرب نہیں " ؎

عشق خاموش کے نزدیک ہیں ہجر

جوشِ فریاد و شوار، ماتم کیا

جب غلاموں کا یہ حال ہے تو آقا اور آقا زادوں کے استقلال و استقامت کا کیا حال ہوگا ——— ذرا غور تو کرو ——— میدانِ کربلا میں اس شہیدِ وفا کی شہادت کے بعد جو کچھ ہوا، وہ وہ نہ تھا جو پیش کیا جاتا ہے اور نہ وہ وہ ہو سکتا ہے ——— ذاکرین اور مرثیہ نگاروں نے جس بے صبری کو اہلِ بیت سے منسوب کیا ہے وہ ادا شناسانِ خاندانِ نبوت کے لئے سخت حیران کن ہے ——— وہ ہر گز ان کی شایانِ شان نہیں ——— یہ تہمت بے تابی ہے ——— اس میں شک نہیں کہ جو کچھ ہوا وہ نہایت المناک و غمناک تھا اور اس المناکی اور غمناکی پر دل خوں کے آنسو روتا ہے ——— لیکن اس جانکاہ حادثہ کا جو رنگ و عمل بتایا جاتا ہے اس نے اہلِ بیت کی سیرتوں کو بے نور بنا دیا ہے ——— عظمت ان کی مظلومیت دکھلانے میں نہیں بلکہ یہ دکھلانے میں ہے کہ جس گھرانے کو اپنوں نے لوٹا اور پامال کیا اس نے کس صبر و استقلال اور ہمت و حوصلے کا مظاہرہ فرمایا۔

مرثیہ نگاروں نے مرثیے لکھے اور مرغوب نام پایا ـــــــ لیکن انہوں نے انحطاط غلامی کے جس دور میں آنکھیں کھولیں اور اپنی عورتوں اور مردوں میں بے صبری کے جو جو مظاہر دیکھے وہ سب ایک ایک کر کے اہلِ بیت کی پاک سیرتوں پر چسپاں کر دئے اور یہ نہ سوچا کہ وہ یہ کیا ظلم کر رہے ہیں ـــــــ مرثیوں میں جس تہذیب کی تصویر کھینچی گئی ہے وہ ہرگز حجازی نہیں خالص ہندی اور وہ بھی اس علاقے سے متعلق ہے جہاں کے مردوں میں مرد انہ پن سے زیادہ زنانہ پن آگیا تھا اور عورتوں کا تو کہنا ہی کیا تھا! ـــــــ

اللہ اللہ جو عزم و ہمت، صبر و استقلال کے روشن مینار تھے ان کی روشنی کو یوں پامال کیا گیا اور مردوں اور مصیبت کے ماروں کو اس طرح بے آسرا کر دیا گیا کہ وہ اس مینارۂ نور سے روشنی حاصل کرنا چاہیں تو مایوس ہو کے ایک ایک کا منہ تکیں اور بزبانِ حال کہیں کہ

ہائے کیا کروں، کہاں جاؤں!

اے ذاکرو! اے مرثیہ نگارو! یہ ظلم تو نہ کرو ـــــــ اور ہاں اے ناموسِ اہلِ بیت کے محافظو! یہ غضب تو نہ کرو، ہوش کی خبر لو ـــــــ تم محبت میں متاعِ محبت برباد کئے دے رہے ہو ـــــــ محبت یہ نہیں کہ اہلِ بیت کو دیارِ ہند کی عام عورتوں کی سطح پر لا کر کھڑا کر دو ـــــــ نہیں ہرگز نہیں ـــــــ وہ بلند تھے، بہت بلند، ان کی بلندیوں کو قائم رکھو!

بین و ماتم سے ان کو کیا سروکار! ـــــــ چودہ سو برس گزر جانے پر بھی ان کے غلاموں کی یہ ادائیں نہیں ـــــــ کم از کم غلاموں کو دیکھ دیکھ کر آقا اور آقا زادوں کو پہچان لو ـــــــ وہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کے تارے تھے، ان کے سامنے آپ کا اسوۂ حسنہ تھا، ان کے سامنے آپ کا پیکرِ استقامت تھا، ہاں اس گھر کا بچہ بچہ کوہِ استقامت تھا، ان پہ بے تابی کی تہمت نہ لگاؤ، ان کو بے صبرا نہ کہو، وہ جانِ صبر ہیں، وہ

روحِ عزیمت ہیں سے

سرداد نداد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسین!

احتساب

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

حاسبوا قبل ان تحاسبوا!

"اس سے پہلے کہ تمہارا حساب کتاب لیا جائے، اپنا حساب کتاب خود کر لو۔"

کیسا اچھا اصول ہے اور کیسی دل لگتی بات فرمائی ہے ——— آئیے ہم خود اپنا محاسبہ کر لیں۔

عہدِ جدید آزادی کے وقت ایک غلغلہ بپا تھا کہ سرزمینِ ہند میں ایک ایسا ملک بنانا ہے جہاں صرف اور صرف اللہ ہی کی حکمرانی ہو اور شریعتِ محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی بالادستی ہو ——— وہ ملک وجود میں آ گیا، ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء ——— لیکن جب بات عمل تک آ پہنچی تو کہا گیا کہ یہاں مسلم اور غیر مسلم دونوں کو اپنے اپنے مذہب کی آزادی ہوگی ——— لیکن آزادی سے قبل یہ مذاہب کب گرفتار تھے جو اب آزاد کئے جا رہے ہیں ——— بات شریعتِ محمدی پر عمل کرانے کی تھی، عمل کرنے دینے کی نہیں ——— عمل کرانے اور عمل کرنے دینے میں زمین آسمان کا فرق ہے ——— اس فرق کو وہی محسوس کر سکتے ہیں جن کو اسلام سے سچی محبت ہے اور جن کے دل میں اسلام کا سچا درد ہے ——— خیر یہ تو تھی برسرِ اقتدار طبقے کی ذمہ داری لیکن ان حریت پسندوں نے کیا کیا جو اسلام کے داعی تھے اور محمد رسول اللہ کے فدائی ——— آؤ ذرا دیکھیں۔

دلوں میں دین کا احترام تھا، نہ رہا ——— دین کی ہر بات بری لگنے لگی منہ سے تعریف کرتے ہیں اور دل سے برا جانتے ہیں ——— دین کی بات کا عمل سے اظہار ہوتا

ہے ——— عمل قطعاً مخالفانہ بلکہ معاندانہ ——— حد تو یہ ہے کہ بعض مجالس میں دین کی باتوں کا مذاق اڑایا جانے لگا ہے ——— استادِ محترم ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے اپنی ایک تقریر میں کیسی دل لگتی بات فرمائی اور کیسا اچھا طنز کیا کہ آنکھیں کھل گئیں ——— آپ نے فرمایا :-

"نماز پڑھے تو ملّا، روزہ رکھے تو ملّا، حج کرے تو ملّا، زکوٰۃ دے تو ملّا، جہاد کرے تو ملّا ——— اور جو کچھ نہ کرے ——— مسلمان!"

ماشاء اللہ، سبحان اللہ! ذرا غور تو کرو، کیا جاہلانہ طرزِ عمل اور یہ اندازِ فکر نہیں؟

سر پر ٹوپیاں تھیں، نابود ہو گئیں، خدا جانے کہاں چلی گئیں! ——— اب تو ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتیں ——— بزرگوں کے سامنے بغیر ٹوپی اوڑھے جانا قیامت تھا، اب بزرگ خورد ننگے سر پھرتے نظر آتے ہیں اور بڑی بے باکی اور بے حیائی کے ساتھ ——— بازاروں میں کھانا، ہوٹلوں میں جانا سخت معیوب تھا، اب بزرگ و خورد سب بازاروں اور ہوٹلوں میں کھاتے نظر آتے ہیں ——— باورچی خانے اوندھے ہو گئے، ہوٹل آباد ہو گئے ——— اقبال نے کہا تھا کہ غلامی میں قوموں کا ضمیر بدل جاتا ہے ——— یہ بات کچھ سمجھ میں آنے والی ہے مگر یہاں تو آزادی نے قوم کا ضمیر بدل دیا ——— ایں چہ بوالعجبی است!

قومی لباس شیروانی و شلوار اور ٹوپی اختیار کیا گیا ——— مگر کتنوں نے اپنایا ——— ہاں دفتروں میں چپڑاسیوں کو پہنے ضرور دیکھا تھا ——— وہی پاکستانی معلوم ہوتے تھے، باقی سب ولایتی ——— اور اب تو یہ شیروانی آثارِ قدیمہ میں شمار ہونے لگی ہے، ہزاروں میں کوئی ہوگا جو پہنتا ہوگا ——— اللہ اللہ ہماری ثقافت نے کتنی جلدی چولا بدلا ——— اس قربانی کے باوجود الزام یہ ہے کہ تم نے ہماری ثقافت نہ اپنائی ——— جس نے اپنا گھر بار لٹایا اور یہاں آ کر ثقافت بھی لٹا دی اس سے شکایت کرتے

ہو! ——— اللہ کچھ تو انصاف کرو!

عورتوں کے بدن پر برقعے تھے اور پھر بھی وہ ڈولیوں میں بیٹھ بیٹھ کر حج یا کرتی تھیں ——— یہ وہ زمانہ تھا جب ہم آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے، ہاں تو عورتیں ڈولیوں میں جاتیں، شہزادیوں کی طرح سوار ہوتیں، چاروں طرف پردے اور ڈولیک بند ——— اور جب ان ڈولیوں سے نجات ملی تو پردے تان تان کے تانگوں میں بیٹھنے لگیں ——— یہ شمالی ہند کے ابتدائی دور کی بات ہے ——— پھر یہاں آکر برقعے پہنے بازاروں میں گھومنا شروع کیا ——— اس پر بھی بس نہیں، منہ کھولے دندناتی پھرنے لگیں اور اب تو یہ برقعہ داغ مفارقت دے چکا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون! ——— یہاں گھرانوں کی بات کر رہا ہوں جو جدوجہد آزادی میں شریک تھے، جو شریک نہ تھے ان سے کیا شکایت وہ تو مقلد ہیں ——— ذمہ دار تو امام ہی ہے ——— ہاں تو برقعے اتار پھینکے اور اب بے برقعہ کوچہ و بازار میں رہ گشت کرتی نظر آتی ہیں، شرم و حیا دیکھ دیکھ کر کڑھتی ہے اور ماتم کرتی ہے ؎

ہائے کیا ہو گیا زمانے کو!

اور برقعہ اتارنے والی بات تو پرانی ہو چکی، کپڑوں کے لالے پڑ گئے، شرم و حیا فیشن کی نذر ہو گئے، وہ وہ لباس اختیار کئے گئے جن سے روح حیا کانپتی ہے ——— دوپٹے سکڑ سکڑا کے گلے میں آ گئے اور بعض اہل ہمت نے یہ پھندا بھی نکال پھینکا ——— اور کپڑے سمٹ سمٹا کے بدن سے جا لگے ——— اللہ اللہ یہ اس ملک کی عورتوں کا حال ہے جو خدا کی خدائی کے لئے بنایا گیا تھا ——— اس حال کو ہم سب نے مل کر پہنچایا ہے، ہم سب ذمہ دار ہیں، خصوصاً جو تحریک آزادی میں شریک تھے اور جن کو اپنی قربانیوں پر فخر ہے ——— اور ہاں بے حجابی کی بات بھی پرانی ہو چکی ——— اب تو محفلوں میں مجلسوں میں، کلبوں میں ہر جگہ اس بے حجاب کو مردوں کے دوش بدوش

دیکھئے ——— کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ایسی مجلس سجائی تھی اور مرد و زن کو یوں یک جا بٹھایا تھا؟ ——— خدارا ذرا تو سوچو! ——— اور یہ مجلس و محفل والی بات بھی پرانی ہونے لگی، فاطمۃ الزہرا کی یہ باندیاں فلموں اور کھیلوں میں پیش پیش نظر آتی ہیں اور وہ وہ تماشے دکھاتی اور وہ گل کھلاتی ہیں کہ شرم کے مارے سر جھکا جاتا ہے ——— تحریکِ آزادی کے وقت یہ باتیں تو خواب و خیال بھی نہ تھیں۔

تقسیمِ ہند سے قبل کسی ڈاڑھی والے کو گالی دیتا اور سگریٹ نوشِ جاں کرتے نہ دیکھا ہوگا لیکن اب یہ باتیں ڈاڑھی کے لوازمات سے ہوگئی ہیں ——— خوب جی بھر کے مغلظات بکی جاتی ہیں اور چہرہ پر دیکھو تو ڈاڑھی ——— سبحان اللہ، ماشاء اللہ ——— اُن فاسقین و فاجرین کی بات چھوڑیئے جو مفرد و مرکب مغلظات میں یگانۂ روزگار ہیں ——— یہاں تو ان کا ذکر ہے جو مسلمان صورت ہیں لیکن ان کو دشمن کی نظر کھا گئی ——— خدا کا شکر ہے کہ لوگ ان گئے گزرے حالات میں بھی ڈاڑھی سے حسنِ عقیدت رکھتے ہیں، ورنہ دوسرے اسلامی ممالک میں (ماسوائے چند ایک کے) اس کی مٹی پلید ہو چکی ہے ——— ہمارے ہاں ڈاڑھی والے سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ عاملِ شریعت ہو کر ایک مثالی کردار پیش کرے گا لیکن جب وہ مایوس کرتا ہے تو لوگ گستاخی پر اتر آتے ہیں تو یہ گستاخی ڈاڑھی کی نہیں، اس کی بداعمالیوں کی ہے ——— تقسیم سے قبل ڈاڑھی والوں کا اخلاقی حال اتنا گرا ہوا نہ تھا، اخلاقی حیثیت سے وہ بہت اونچے تھے مگر اب دیکھ دیکھ کے سخت مایوسی ہوتی ہے۔

قارئینِ کرام ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ لکھنے والا اس نعمت سے محروم ہے، نہیں نہیں ——— جبھی تو دل سوزی کے ساتھ یہ آپ بیتی سنا رہا ہوں ——— کہاں تک سناؤں، اس کے لئے تو دفتر کے دفتر درکار ہیں۔

استاد اور شاگرد کہا جاتا ہے استاد شاگرد کا تعلق ایسا ہے جیسے باپ بیٹے یا جیسے بھائی بھائی ——— بیشک ایسا ہی ہے لیکن کیا کسی گھر میں کسی اولاد نے والدین سے اپنے مطالبات منوانے اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کبھی یونین بنائی ہے؟ اور ایک متوازی حکومت قائم کی ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہوا ——— اور ہاں ایسا بھی نہیں ہوا کہ والدین نے اپنے بچوں سے یا بڑے بھائیوں نے اپنے چھوٹے بھائیوں سے چکا چکا کر پیسے لئے ہوں ——— ان کو اس طرح گھور گھور کے دیکھا ہو جیسے مجرم کو سپاہی گھورا کرتا ہے ——— ان کی کوتاہیوں کو نظر انداز کرنے کے بجائے ان سے خوب خوب انتقام لیا ہو ——— کم از کم مسلمانوں کی تاریخ کے چودہ سو برسوں میں یہ نہیں ہوا۔

جب استادوں کے لئے طلبہ مالِ تجارت بن جائیں تو خلوص و محبت کی بات کیسے پیدا ہو سکتی ہے ——— عربی مدارس میں استادوں کو ہمیشہ پڑھاتے دیکھا ——— ہاں وہ خلوتوں اور خلوتوں میں پڑھاتے ہیں، طلبہ سے صلہ نہیں لیتے، وہ اس کو عار سمجھتے ہیں، صلہ لینا تو بڑی بات ہے وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، ان کا حال اس شعر کے مصداق ہے ؎

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احسان میرا

مگر انگریزی اسکولوں اور کالجوں کا حال کچھ مختلف ہے ——— وہاں استاد پڑھاتے ہیں اور پوری پوری مزدوری لیتے ہیں ——— اور اس پر بھی بس نہیں، مطالبوں پہ مطالبے کرتے ہیں، سو سے ہزار، ہزار سے دو ہزار، دو ہزار سے تین ہزار تک

اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے!

——— ٹیوشن کی بات ان آرزوؤں پر مستزاد ہے اور کاپیاں جانچنے والی بات مستزاد

پہ مستزاد، مگر پھر بھی ؎

چین ملتا نہیں ذرا دل کو

عربی مدرسوں اور انگریزی مدرسوں کی تنخواہوں کا تقابل کریں تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا لیکن وہاں قناعت پذیری کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں ——— کسی سے کچھ نہیں مانگتے، باوقار رہتے ہیں اور علمی شرافت و وجاہت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ——— انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں اساتذہ کا اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے اب حال یہ ہو گیا ہے کہ وہ ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے سے رہتے ہیں ——— بلکہ قوم کے سب ہی بزرگ ڈرنے لگے ہیں، یہ وقت کبھی نہ دیکھا تھا کہ بڑے چھوٹوں سے ڈرنے لگیں ——— تقریر کرتے ہیں تو انداز خوشامد یہ فرماتے ہیں کہ "مستقبل کے معمار تو آپ ہی ہیں، آپ ہی کو حکومت سنبھالنی ہے" ——— غور کر دیا اتنی بڑی حقیقت ہے کہ اگر اس کو تسلیم نہ کیا جائے تو خود تسلیم کرا کے چھوڑے گی ——— یہ ازلی اصول ہے کہ چھوٹے بڑوں کی جگہ لیتے ہیں ؎

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانا ہم کو

ہاں اس طرح زندگی کا قافلہ رواں دواں رہتا ہے، بھلا اس کی کیا ضرورت ہے کہ ہم چیخ چیخ کر اس واضح حقیقت کا اعلان کرتے پھریں؛ ——— ایک طرف خوشامد کے جرم میں مبتلا ہوں اور دوسری طرف مستقبل کو تابناک دکھا دکھا کر جوانوں کی آنکھیں خیرہ کر کے ان کو کہیں کا نہ رکھیں ——— وہ اسی خوشی میں جوانی کے دن گننے لگیں کہ کب وقت آتا ہے، بزرگ اللہ کو پیارے ہوتے ہیں اور ہمارے سر پہ تاج شاہی رکھا جاتا ہے ——— پھر ہر ایک کے سر پہ تو تاج رکھا نہیں جائے گا، معدودے چند ہو گئے، اس طرح مسابقت کے جذبے کے ساتھ تعصب و خود غرضی و خود پسندی کے جذبات بھی ابھرنے لگتے ہیں ——— اور وہ ابتدائی منزلوں کی ان ذمہ داریوں سے بے پرواہ

ہو جاتے ہیں جن کا پورا پورا احساس مستقبل کی ذمہ داریوں کے لیے ضروری ہے ——— کوئی بچہ فوراً جوان نہیں ہو جاتا ——— منزل بہ منزل بڑھاپے تک پہنچتا ہے ——— اس طرح ہر منزل کی اپنی ذمہ داریاں ہیں اور ان پر نظر رکھنا ضروری ہے۔

کسی امیر و کبیر انسان نے اپنے بیٹوں سے کبھی یہ نہ کہا ہوگا کہ تجھے کھانے کمانے کی ضرورت نہیں ہے، میں نے بہت کچھ کما لیا ہے، یہ سب کچھ تیرے ہی لیے ہے، تو ہی اس دولت کا مالک و مختار ہے ——— اس حقیقت کا اعلان قوت عمل کو ضائع کر دیتا ہے، اسی لیے امیر و کبیر لوگ بھی اپنے بچوں کو زندگی کی کشمکش میں مبتلا کرتے ہیں تاکہ ان میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو اور وہ ان کی کمائی ہوئی دولت کی صحیح قدر و منزلت کر سکیں ——— جس امیر و کبیر نے ایسا نہ کیا اس کے بچے بے حس رہتے ہیں، ذمہ داری کا ذرہ بھر احساس نہیں ہوتا اور باپ کے مرنے کے بعد اس کی کمائی ہوئی دولت عیاشیوں کی نذر ہو جاتی ہے۔

پس دانائی یہ ہے کہ طالب علموں کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کیا جائے اور مستقبل کی تابناکی دکھا دکھا کر خواہ مخواہ ان کو خوش فہمی میں مبتلا کر کے بزرگوں سے برگشتہ نہ کیا جائے اور ایسا آدمی نہ بنایا جائے جو خود کچھ نہیں کرتا اور اپنے بزرگوں کی موت کے انتظار میں زندگی کے دن گن گن کر گزارتا ہے۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی ——— ذکر تھا استاد کے ڈرنے سہنے اور طالب علم کی خوشامد کرنے کا ——— خوشامد و تملق نے استاد کو اس کے عالی منصب سے نیچے گرا دیا ہے ——— استاد کو ایسا نہ ہونا چاہیے ——— وہ علم و فن ہی میں یگانہ نہ ہو بلکہ حسن خلق میں بھی یگانہ ہو، خود تربیت یافتہ ہو اور تربیت کے فن سے واقف ہو، بے لوث و بے غرض ہو، پیکر شفقت ہو ——— پھر ممکن نہیں کہ طالب علم اس کے مقابل آئے یا وہ طالب علم سے ڈرے ——— لیکن جس مثالی استاد کا ذکر کیا ہے، کم از کم ہمارے علمی اداروں میں نایاب ہوتا جا رہا ہے ——— ہم اس طالب علم سے

جو کل تک شوخ و چنچل تھا، ہر برائی جس کے لئے دل لگی تھی اور ہر نیکی جس کے لئے مذاق، آج استاد بن جانے کے بعد یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ چشم زدن میں اپنی ماہیت تبدیل کر کے ایک سنجیدہ ورجیدہ اور مثالی استاد بن جائے ـــــ چشم زدن میں استاد نہیں بنا کرتے، اس کے لئے تو مسلسل تربیت کی ضرورت ہوتی ہے ـــــ جو کل تک خود تربیت کا محتاج تھا، آج مربی کیسے بن سکتا ہے؟ ذرا سوچو تو سہی! ـــــ بیک جنبشِ قلم کوئی ذرہ سے آفتاب نہیں بنا کرتا ـــــ اخلاقی قدروں پر سختی سے عمل کرنے اور عمل کرانے کی ضرورت ہے، اس میں ڈھیل دی تو سارا نظام درہم ہو کر رہ جائے گا ـــــ اصلاحِ حال کی پہلی منزل طالبعلم ہے، یہی آگے چل کر استاد بنتا ہے، حکومت و معاشرت کا جس پر دارومدار ہے، اس لئے اس کی اصلاح سے ہرگز بے پرواہ نہ ہونا چاہئیے۔

حساب و کتاب

زندگی، زندگی سے بنتی ہے ـــــ صرف کتاب سے نہیں بنتی ـــــ اگر ایسا ممکن ہوتا تو قرآنِ کریم کو وہ دن پر نازل ہو جاتا اور رسولِ کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی تابناک سیرت سامنے نہ آتی ـــــ لیکن اس کو سامنے آنا تھا، وہ سامنے آکر رہی اور جب سامنے آئی تو یوں محسوس ہوا جیسے لفظوں میں جان پڑ گئی۔

دنیا کا کوئی ضابطۂ حیات ایسا نہیں جو کسی ایک شخصیت میں جیتا جاگتا نظر آئے، اسی لئے کوئی ضابطہ اتنا مؤثر نہ ہو سکا جتنا قرآن مؤثر ہے ـــــ قرآن نے سیرتِ رسول (علیہ السلام) میں جان ڈالی اور سیرتِ رسول نے قرآن میں جان ڈال دی ـــــ جس طرح حرف و معنی کو الگ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح قرآن اور سیرتِ رسول کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا ـــــ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اشارہ فرمایا اور یہی وہ حقیقت ہے جس کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ رسولِ کریم محض ایلچی تھے جو ایک بادشاہ کا پیغام دوسرے بادشاہ کو پہنچایا کرتا ہے اور پھر اس کا کام ختم ہو جاتا ہے ——— لیکن خدائے واحد کی حکومت میں دوسرے بادشاہ کا وجود ہی کہاں ہے؟ ——— رسولِ رحیم نے ایک بادشاہ کا پیغام دوسرے بادشاہ کو نہیں پہنچایا ——— وہ ایک بادشاہِ مطلق کی طرف سے رعیت کی اصلاحِ حال کے لئے نائب السلطان بن کر تشریف لائے (صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم) ——— جس نے ایلچی سمجھا اس نے اس عظیم حقیقت کو فراموش کر دیا کہ انسان صرف کتاب سے نہیں بنا کرتا ——— اس کی تعمیر کے لئے زندگی چاہئے زندگی! ——— رسولِ کریم کو کسی حال میں الگ نہیں کر سکتے ——— وہ کتاب اللہ کی جان ہیں ——— وہ جانِ ایمان ہیں ؎

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

قانونِ الٰہی

قانونِ الٰہی کی روح یہ ہے کہ مخلوقِ الٰہی کے لئے آسانیاں ہوں اور دشواریوں سے نجات ملے ——— لیکن ہم نے اس روح کو فراموش کر دیا اور اس حد تک فراموش کر دیا کہ انسانی راحت و سکون کو بالائے طاق رکھ کر اس کی ایذا رسانی کے لئے قانون بنایا جاتا ہے ——— قدم قدم پر قانون کے حوالے دیتے ہیں اور گرفت پہ گرفت کرتے ہیں ——— اس طرح ہم خود قانون کو بے کیف بنا دیتے ہیں ——— اور پھر مخلوقِ خدا میں اس سے محبت کی بجائے نفرت پیدا ہونے لگتی ہے جو نظامِ حکومت کے لئے سخت مہلک ہے۔

قرآنِ کریم عالمِ انسانیت کا غم خوار و دلدار بن کر آیا جبھی تو مخلوقِ خدا نے اس کے لئے اپنی جانیں قربان کیں اور ہر وقت اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار رہے ورنہ بھلا یہ دنیا میں کس قانون کی حفاظت و احترام کے لئے دنیا والوں نے اس طرح جانیں

نچھاور کیں؟ ــــــ قانونِ الٰہی سے یہ پیار و محبت کیوں اور قانونِ فانی سے یہ نفرت و دل برداشتگی کیوں؟ ــــــ اسی لئے کہ اِس کی بنیاد عشق و مستی پر ہے اور اُس کی بنیاد جبر و قہر ہے۔

قانون سازی کے سلسلے میں ایک اہم نکتہ قرآنِ کریم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جس طرح خدا نے بندوں کو یہ حق نہیں دیا کہ کسی بندے سے اپنی عبادت کرائیں؛ اسی طرح یہ حق بھی نہیں دیا کہ بادشاہِ مطلق بن کر کسی بندے کے لئے اپنا قانون نافذ کریں ــــــ اللہ اللہ خدائے باقی کے بندے اور بندۂ فانی کا قانون! ــــــ یہ کیسی گستاخی ہے! ــــــ یہ کیسی جرأت ہے!

قرآن نے ایک بے مثال جمہوریت کا درس دیا اور انسان کو انسان سے آزاد کر کے بلند سے بلند تر کر دیا ــــــ ایک انسان کی حکومت ہو یا کئی انسانوں کی ــــــ حکومت بہر حال انسان ہی کی ہوئی ــــــ وہ انسان جو کسی وقت بھی گمراہ ہو سکتا ہے ــــــ جو جذبات کا تابع ہے ــــــ کسی وقت بھی جابر و قاہر اور ظالم و سفاک بن کر سامنے آسکتا ہے ــــــ یہ بات عظمتِ انسانیت کے منافی ہے کہ اس پر خدا کا نہیں غیر کا حکم نافذ ہو ــــــ اسی لئے خدائے غیور کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ وہ اس طرح بندوں کو بندوں کے ہاتھ ذلیل و رسوا کرے ــــــ اُس نے انسان کو اپنے قانون کا امین بنایا ہے ــــــ نہ صرف یہ کہ بندوں کو بندوں سے آزاد کرا دیا بلکہ بندوں کو فکرِ جہانبانی سے آزاد کر دیا۔ (جل جلالہ وعم نوالہ)

زمین و آسمان | جہاں جائیے وہی زمین ــــــ اسی کی مخلوق، اسی کی خدائی ــــــ کیا خوب کہا ہے ؎

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے کیا کروں کہاں جاؤں!

لیکن نظر اتنی محدود ہو گئی کہ خدا کی خدائی میں بے چین رہتے ہیں ——— جہاں رہتے ہیں وہاں سے جانا نہیں چاہتے ——— بھیج دیا جائے تو مضطرب و پریشان ہو جاتے ہیں جیسے کسی دوسرے خدا کی خدائی میں چلے گئے ہوں ——— سرکاری ملازمین اس بیماری میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں ——— ان کی زندگی میں اختیار کم ہے ——— جبر زیادہ ——— اسی لئے تبادلہ ہوا نہیں اور گھبراہٹ چھوٹی نہیں! ——— جیسے خدا نے اپنے در سے نکال دیا ہو۔

جس بستی میں جاؤ، جس شہر میں جاؤ، جس گلشن میں جاؤ، جس صحرا میں جاؤ، بحر و بر کے کسی گوشے میں جاؤ وہاں خدا ہی کی خدائی ہے ——— وہی زمین و آسمان اور وہی مخلوق ——— ہاں شہر کی رونقیں جدا جدا ہیں، سو ان عارضی رونقوں سے دل لگانا دانائی نہیں ——— یہ تو سب فنا ہونے والی ہیں ——— باقی رہنے والا اُسی کا ملک ہے ——— پھر یہ فرار کیوں؟ ——— یہ گھبراہٹ کیوں؟ ——— یہ بے چینی کیوں؟ ——— اے پست ہمت! ہمت بلند رکھو اور خدا کی خدائی میں دل لگا کر رہو ——— گھبراتے کیوں ہو، وہ ہر جگہ تمہارا حامی و ناصر ہے ——— سب بھول جائیں گے ——— وہ نہیں بھولے گا ——— سب روٹھ جائیں گے ——— وہ نہیں روٹھے گا ——— اللہ اللہ وہ کیسا رحیم و کریم ہے!

غیبتیں اور چغلیاں

دوسروں کی برائیاں کرنے اور چغلیاں کھانے میں انسان کو بڑا مزا آتا ہے ——— جہاں دو جمع ہوئے وہاں تیسرے کی چغلی ——— جہاں تین جمع ہوئے وہاں چوتھے کی چغلی ——— جہاں چار جمع ہوئے وہاں پانچویں کی چغلی ——— غرض اس مرغوب مشغلے میں وہ شغف و انہماک ہے کہ بس دیکھا کیجئے ——— یوں محسوس ہوتا ہے کہ معاشرہ کا ہر فرد بہ زبانِ حال کہہ رہا ہے:

اب یہی روزگار ہے اپنا

عالم و عامی سب اس بلا میں مبتلا ہیں ——— عالم اپنے زورِ علم سے فتوائے جواز نکال لاتے ہیں ——— خصوصاً اپنے مخاصمین و معاندین کے لئے ——— عامی فتویٰ

نویسی سے معمور ہیں لیکن غیبت میں معروف ہیں ـــــ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ قرآن نے کیا کہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا ـــــ سنئے سنئے، قرآن کہتا ہے :

"(اے چغلی کھانے والے!) کیا تو یہ پسند کرے گا کہ مردہ بھائی کی لاش بھنبوڑے! ـــــ ہرگز پسند نہ کرے گا"

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"مبارک ہے وہ جو اپنے عیوب کی تلاش میں ایسا منہمک ہوا کہ دوسروں کی عیب جوئی کی اس کو فرصت ہی نہ ملی"

آپ نے دیکھا کہ چغلی کھانے والے کے لئے کیسی وعید ہے اور غیبت سے پرہیز کرنے والے کے لئے کیسی خوشخبری ہے!

ایمان کے تین مدارج ہیں ـــــ برائی کو دیکھ کر ہاتھ سے روک دینا ـــــ نہیں تو زبان ہی سے باز رکھنا ـــــ ورنہ پھر دل سے برا جاننا ـــــ ایمان کی دو منزلوں سے گزر کر ہم تیسری منزل تک پہنچے ہیں اور یہ بھی اس کو میسر ہے جس کے دل میں کچھ روشنی ہے ورنہ ظلمت کا یہ عالم ہے کہ ہر بُری بات اچھی لگنے لگی اور ہر اچھی بات بُری ـــــ جب اشیاء کی حقیقتیں بدل گئی ہوں تو ایمان کا کیا نام لیا جائے جس کی بنیاد حقیقتوں اور صداقتوں پر ہے ـــــ

اس دورِ پُرآشوب میں غیبت سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ خود کو مصروف رکھئے، کچھ کرتے رہیے، خالی نہ بیٹھئے ـــــ سب سے ملئے مگر کم کم ـــــ بات کیجئے، چغلی کی نوبت آئے، کترا جائیے ـــــ کترانے نہ دیں، اٹھ جائیے ـــــ خود کو سنبھالے رکھیئے ـــــ بچاتے رہیئے ـــــ شیطانِ لعین دامِ تزویر بچھائے ہماری تاک میں ہے ـــــ اس سے باخبر رہیئے ـــــ بے خبر ہوئے نہیں اور پھنسے نہیں ـــــ کبھی وہ یہ کہہ کر دھوکا دیتا ہے کہ جو برائیاں بیان کی جاتی ہیں یہ تو اس میں

ہیں جس کی برائیاں بیان کی جا رہی ہیں ——— ہرگز ہرگز اس دھوکے میں نہ آیئے ———
سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حقیقی برائیوں کا پس پشت بیان کرنا ہی غیبت ہے
——— جھوٹی برائیوں کا منسوب کرنا تو بہتان ہے ——— غیبت نہیں ——— پس
غیبت سے بچتے رہیئے ——— نظر اپنی طرف رکھیئے ——— عیب گنتے گنتے تھک
جائیں گے ——— کسی کی غیبت کا ہوش نہ رہے گا۔

نصیحت و اجرت یہ کبھی سنا ہوگا کہ اجرت لے کر اور چکا چکا کر کسی نے تبلیغ و ارشاد
کا کام کیا ہو ——— لیکن دورِ جدید میں یہ بھی ہوتا ہے ———
جب نصیحت اللہ کے لیے کی جاتی تھی، بلا کا اثر تھا، اب وہ اثر باقی نہ رہا کہ نصیحت نہ ہی ———
دل میں سوز نہیں تو آواز میں ساز کہاں سے آئے اور جب آواز میں ساز نہیں تو دل کیسے کھنچیں اور
دل میں بات کیسے اترے؟ ——— اب تو حال یہ ہے ؎

کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

محراب و منبر میں، محفل و مجلس میں، ریڈیو و ٹیلی ویژن میں ہر جگہ اجرت لے کر نصیحت کی جاتی
ہے لیکن یہ نصیحتیں اثر سے بیگانہ ہیں، اب وہ بات نہیں ؎

نقطۂ نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا

ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ ڈاکو ساتویں مرتبہ قید کاٹ کر جب رہا ہوا تو اس کو پھر چوری کی سوجھی
——— رات کا وقت تھا، ہر طرف سناٹا ہی سناٹا تھا ——— ایک مکان کے پچھلے
حصے سے اندر داخل ہوا ——— اِدھر اُدھر تلاش کیا کوئی چیز نہ ملی، کپڑوں کے تھان رکھے
تھے، انہیں کو باندھنا شروع کیا ——— لیکن مشکل یہ آپڑی کہ ہاتھ پیر سزاؤں کی نذر ہو چکے
تھے ——— لُولا لنگڑا تھا مگر اپنے پیشے میں ایسا طاق کہ بالائی منزل پر چڑھ گیا اور کمرے
کے اندر داخل ہو گیا ——— ہاں تو کپڑے کی گٹھری باندھتے باندھتے پسینوں میں شرابور ہو گیا

——— اچانک کمرے کا دروازہ کھلتا ہے اور ایک بزرگ نمودار ہوتے ہیں ——— یہ سمجھتا ہے کہ شاید یہ بھی کوئی ڈاکو ہے جو رات گئے اِدھر نکل آیا ہے ——— ان بزرگ نے اُس کو دودھ لاکر پلایا اور سامان کی چھوٹی بڑی دو گٹھڑیاں باندھیں ——— اب تو اس کو بالکل یقین ہو گیا کہ یہ کوئی ڈاکو ہی ہے ——— صبح ہونے والی تھی، یہ دو گٹھڑیاں سنبھال کر گھر سے باہر نکلے اور صحرا کی طرف چل پڑے ——— بڑی گٹھڑی بزرگ نے اٹھائی اور چھوٹی گٹھڑی اس لُوٹے لنگڑے ڈاکو نے ——— چلتے چلتے وہ ڈاکو پہاڑ کے دامن میں اپنی غار تک پہنچ گیا ——— گٹھڑیاں رکھ دی گئیں ——— ڈاکو نے ترس کھا کر بزرگ سے کہا کہ لاؤ تمہارا حصہ تم کو دے دوں ——— بزرگ نے فرمایا :

"یہ سامان تو میرا ہی ہے"

یہ کہہ کر چل دیئے اور ڈاکو کے دل پر ایک بجلی سی گر گئی ——— صبح ہو چکی تھی، دل نے کہا کہ چلو پھر اس بوڑھے کے مکان پر چلیں ——— گیا ——— کیا دیکھتا ہے کہ مجلس جمی ہے ——— ہزاروں انسان سر جھکائے سراپا گوش بنے، دو زانو بیٹھے ہیں ——— یہ مجلس میں داخل ہوا ——— داخل ہوا ہی تھا کہ اس بزرگ کی نظر اس پر پڑی اور اپنا کام کر گئی ؎

ایک ہی بار ہوئیں وجہِ گرفتاریٔ دل
التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

اللہ اللہ ؎

خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے
یہ اثر رکھتی ہے خاکسترِ پروانۂ دل

اب یہ ڈاکو، ڈاکو نہ رہا بلکہ عارف باللہ ہو گیا اور اس کا شمار عرفا و صلحا میں ہونے لگا ——— یہ اعجاز تھا اس بزرگ کی نگاہ کیمیا اثر کا جس کا نام نامی اسم گرامی جنید بغدادی رضی اللہ

تعالیٰ عنہ) ہے۔ اللہ اکبر! منہ سے کچھ نہ کہا اور ذرّے کو آفتاب بنا دیا ——— جب نظر کا یہ فیض تھا تو صحبت کا فیض کیا ہوگا اور پھر نصیحت کا کیا اثر ہوگا!

آپ نے دیکھا حضرات اہل اللہ نے کسی سے مال نہ لیا بلکہ اپنا مال دوسروں پر لٹا دیا ——— جب تک یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا صحبت و نصیحت اثر دکھا ہی نہیں سکتی ——— نصیحت و جرأت میں کوئی رشتہ نہیں ——— اللہ اللہ محراب و منبر میں اجیر، مجلس و محفل میں اجیر، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اجیر ——— ان اجیر واعظوں اور ناصحوں کو دیکھ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے ——— کس دبدبے اور طنطنے سے بیٹھتے ہیں ——— کیسی دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں اور کیسے روپے بٹورتے ہیں ——— جب جان پیسوں میں اٹکی ہو تو تقریر جان پرور کیسے ہو سکتی ہے؟

اے واعظو اور اے ناصحو! تم جانشین مصطفےٰ ہو، محراب و منبر کی لاج رکھو ———! دیکھو دیکھو کہیں تمہاری ہوس پرستی کشتیٔ امت کو ڈبو نہ دے ؎

فریاد ہے، اے کشتیٔ امت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

مریض و حکیم

ہونا تو یہ چاہیے کہ مریض حکیم کے کہے پر چلے لیکن ہوتا یہ ہے کہ حکیم مریض کے کہے پر چلتے ہیں اور پھر مریض کا کیا حال ہوتا ہے ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ایک حکیم حاذق کے پاس مریض آئی، حکیم صاحب نے نبض دیکھی اور نسخہ لکھنے لگے ——— مریضہ بولیں "حکیم صاحب اس میں عناب بھی لکھنا" ——— پھر تھوڑی دیر بعد بولیں "اور سونف بھی لکھنا" ——— کچھ دیر نہ ہوئی تھی کہ پھر بولیں "اور ملٹھی بھی لکھنا" ——— حکیم صاحب سے رہا نہ گیا، انہوں نے کاغذ قلم اس کے آگے رکھتے ہوئے فرمایا ——— "پھر تم خود ہی نسخہ لکھ لو" ———

میں بگڑتا چلا جاتا ہے ـــــ ہم زہر پلاتے ہیں وہ پیتا چلا جاتا ہے۔

ایک بے بس اور مجبور انسان جب کسی عہدے پر فائز ہوتا ہے، ماتحت خوشامد، چاپلوسی سے منہ پہ چڑھتے اور دل میں گھر کرنے کی کوشش کرتے ہیں ـــــ رقابت، مسابقت پر مجبور کر دیتی ہے ـــــ پھر ایک سے ایک بڑھ کر خوشامد کرتا ہے اور اس کوشش میں انسان خود کو ذلیل و خوار کر دیتا ہے ـــــ کہیں آیۂ کریمہ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ میں اس طرف تو اشارہ نہیں ؟ ـــــ ہاں تو انسان خوشامد و تملق سے انسان کو تراش خراش کر بت بنا دیتا ہے اور رفتہ رفتہ بات ہاتھوں سے نکل جاتی ہے اور وہ جابر و قاہر بن جاتا ہے، وہ مطلق العنان بن جاتا ہے، جو جی میں آتا ہے کرتا ہے، کوئی ٹوکنے والا نہیں ہوتا۔

سادہ لوح انسانوں کی حیرانیاں تو ملاحظہ ہوں ـــــ ایک انسان جو پہلے بھی اپنا کام کرتا تھا ـــــ عام سواریوں میں سفر کرتا تھا ـــــ عام لوگوں سے ملتا جلتا تھا ـــــ کبھی کبھی معمولی لباس بھی پہن لیا کرتا تھا ـــــ سب کے ساتھ ہنستا بولتا تھا ـــــ مگر اب جب وہ مسند نشین ہو چکا ہے، اس کی ہر بات بطور یادگار ہے ـــــ جب وہ خود کام کرتا ہے تو لوگ حیرت سے اس کا منہ تکتے ہیں ـــــ جب وہ عام لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہے تو لوگ ایک ایک سے جا کر بیان کرتے ہیں ـــــ جب وہ ہنستا بولتا ہے تو لوگ کھل کھلا اٹھتے ہیں ـــــ غرض جو کچھ وہ پہلے کرتا تھا، اب جو کرتا ہے تو ہر طرف سے غوغائے تحسین و آفریں بلند ہوتے ہیں ـــــ یہی وہ نازک گھڑی ہے جب انسان بگڑنا شروع ہوتا ہے، وہ سوچنے لگتا ہے کہ میں کیا سے کیا ہو گیا ـــــ ! پھر اُس کا جی چاہنے لگتا ہے کہ لوگ اُس کی ایک ایک بات کی تشہیر کریں اور ہر بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کریں ـــــ یہ لت اُس کو عارضی شہرت تو بخش دیتی ہے لیکن وہ شہرتِ دوام سے محروم رہتا ہے، شہرتِ دوام کا تعلق سچی سیرت اور بے داغ کردار سے ہے ـــــ اور ایسی تابناک سیرت کو تحسین و آفریں کی ضرورت نہیں۔

بت سازی اور بت گری کا یہ عمل نہ معلوم کب سے چلا آرہا ہے ——— مدنی تاجدار (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس بت کو پاش پاش کر دیا ——— اور انسان کو اس کے مقام سے آگاہ کیا اور یہ بتایا کہ منصب و عہدے سے انسان بدلا نہیں کرتے ——— انسانیت ایک عظیم حقیقت ہے ——— جب آپ کو منصب رسالت و نبوت ملا تو معاذ اللہ غرور و تکبر سے سر اونچا نہ کیا بلکہ عاجزی و انکساری سے زمین پر جھک کر چلتے رہے ——— ذرا غور تو کرو ——— سیرت پاک کی رفعت تو دیکھو! ——— سینۂ اقدس کی وسعت تو دیکھو! ——— رات رات بھر نفل پڑھتے ——— جب رفیقۂ حیات ام المؤمنین نے عرض کیا کہ "آپ کا مولیٰ تو آپ سے راضی ہے پھر رات رات بھر آپ کیوں نفل پڑھتے ہیں" ——— ؛ فرمایا ——— کیا اپنے مولیٰ کا شکر ادا نہ کروں" ——— ! دیکھا آپ نے ——— ! اب ذرا دیکھئے ہم میں سے کتنے ایسے ہیں کہ منصب ملنے کے بعد یوں سر جھکائے رات رات بھر خدا کے سامنے کھڑے ہوں ——— یہ تو بہت بڑی بات ہے ——— بہت اونچی بات ہے ——— فرائض سے بیگانہ ہو جاتے ہیں ——— خدا کو بھول جاتے ہیں اور زعم اقتدار میں مخلوقِ الٰہی پر ظلم کرنا شروع کر دیتے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اے انسانو! اپنے مقام کو پہچانو، دوسروں کو بت بنا بنا کر یوں خود کو ذلیل و خوار مذکرو ——— اور اے منصب والو! کرسیوں پر اکڑ اکڑ کر نہ بیٹھو ——— محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے روشن نمونے سامنے رکھو ——— سر جھکائے رکھو ——— مخلوقِ خدا پر مہربان رہو ——— خدا سے ڈرتے رہو ——— جس نے عزت دی ہے وہ ایک آن میں ذلیل و خوار کرنے پر بھی قادر ہے ——— ہزاروں معزز ہو کر اپنی ناشکری اور ناسپاسی کی بدولت ذلیل و خوار ہو چکے ہیں ——— ان سے عبرت حاصل کرو!

عظمتِ مستعار

ایک وہ ہیں جن کی عظمتیں ان کے باہر لٹکی ہیں ——— اور ایک وہ ہیں جن کی عظمتیں ان کے دل میں اٹکی ہیں بلکہ چپکی ہیں ——— ہٹائے نہیں ہٹتیں ——— حقیقی عظمت کے سامنے عظمتِ مستعار کی کیا حقیقت؟

وہ زندہ رہتے ہیں تو عظیم ——— مرتے ہیں تو عظیم ——— حشر میں اٹھیں گے تو عظیم ——— ان کی عظمت کو کوئی چھین نہیں سکتا ——— اور ہاں وہ بھی ہیں جن کی عظمت مستعار ہے ——— زرق برق کپڑوں، شاندار کوٹھیوں، لمبی لمبی کاروں، اونچے اونچے عہدوں میں ان کی عظمت لٹکی ہے ——— کپڑوں پر داغ نہ پڑ جائے کہ عظمت داغدار ہو جائے گی ——— کوٹھیوں کا رنگ روغن خراب نہ ہو جائے، در و دیوار بوسیدہ نہ ہو جائیں کہ عظمت خراب و خستہ ہو جائے گی ——— کاریں بگڑ نہ جائیں کہ عظمت بگڑ جائے گی ——— عہدوں سے ہٹا نہ دیے جائیں کہ عظمت ہٹ جائے گی۔

غور کیجیے، یہ عظمتِ مستعار کیسی معرضِ خطر میں ہے ——— تاریخِ عالم کا مطالعہ کیجیے ——— ایسے کتنے عظیم انسانوں کی عظمت دیکھتے دیکھتے گردشِ دوراں کی نذر ہو گئی ——— اور وہ گلیوں میں ٹھوکریں کھاتے پھرے، کوئی ان کا پرسانِ حال نہ رہا ——— لیکن ایک عظیم وہ ہیں جن کے پاس زرق برق کپڑے نہیں، شاندار کوٹھیاں نہیں، لمبی لمبی کاریں نہیں، اونچے اونچے عہدے نہیں ——— ہاں پھر بھی وہ عظیم ہیں، ان کی عظمت خدا کے سوا کوئی نہیں چھین سکتا ——— وہ کچھ اور بوسیدہ مکانوں میں رہتے ہیں لیکن پھر بھی عظیم ——— وہ افسرِ اعلیٰ نہیں، فقیرِ بے نوا ہیں لیکن پھر بھی عظیم ——— ہاں ہاں ؎

دربارِ شہنشی سے خوش تر
مردانِ خدا کا آستانہ

مزاجِ عالم

دورِ جدید کی سیاست، زمانۂ ماضی کی سیاست سے بالکل مختلف ہے ——— مشکل اور پیچیدہ ——— سبک رفتار ذرائع عمل و نقل، برق رفتار وسائلِ رسل و رسائل، حیرت انگیز آلاتِ حرب اور عالمگیر معاشی نظام نے سب کو چوکنا کر دیا ہے ——— ماضی میں کوئی بادشاہ یا حاکمِ وقت اپنے ملک یا ملک کے کسی صوبہ میں کچھ کرتا تھا تو صرف پاس پڑوس پر سرسری نظر کے ساتھ ساتھ ملکی سیاست پر گہری نظر رکھتا تھا ——— لیکن جدید سیاست میں صرف اتنا کافی نہیں ——— دنیا کے کسی گوشے میں حکومت کیجئے مگر سارے عالم پر نظر رکھیئے ——— پھونک پھونک کر قدم رکھیئے ——— ذرا چوکے مارے گئے ——— یوں کہنے کو تو ہر ملک آزاد ہے، کوئی کسی کے ملک اور ملکی معاملات میں دخیل نہیں ——— مگر تیور کچھ اور بتا رہے ہیں، تیوروں پر نظر رکھنا ضروری ہے ——— اس سے بے خبر ہوا غیظ و غضب کا شکار ہوا۔

معمولی سے معمولی اقدام کے لئے بڑی سیاسی بصیرت کی ضرورت ہے ——— کرتے اپنے ملک میں ہیں، مزاجِ عالم پر نظر رکھنی پڑتی ہے کہ کہیں بگڑ تو نہیں رہا ——— ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں بھارت نے مزاجِ عالم کو نظر انداز کیا تو کیا پایا؟ ——— مزاجِ عالم بہت ہی نازک ہے اس لئے ہرگز ہرگز اس طرف سے بے خبر نہ ہونا چاہیئے ——— جس کو صرف اپنی خبر ہے اور عالم سے بے خبر ہے، وہ حکمرانی کے لائق نہیں ——— جہانبانی کے لئے بڑے باخبر انسان کی ضرورت ہے اور جب یہ میسر آجائے تو وہ کام کر گزرتا ہے کہ دنیا دیکھ دیکھ کے انگشت بدنداں رہ جائے ——— قصۂ آدم و ابلیس میں یہی سیاسی نکتہ بیان کیا گیا ہے ——— جہانبانی کے لئے شرافتِ نفس سے زیادہ علم و فضل کی ضرورت ہے ——— مزاجِ عالم کو پرکھنا بے خبروں کا نہیں باخبروں کا کام ہے۔

غیرتِ کفر

غیرتِ اسلام کے مظاہر چشمِ عالم نے دیکھے تھے ——— مگر غیرتِ کفر کا تماشا دورِ جدید نے دکھایا ——— غیرتِ اسلام جب خوابیدہ ہوتی ہے تو

غیرتِ کفر جاگ اٹھتی ہے ——— ایک پڑوسی ملک نے اپنے ہم مذہبوں کے سلئے کیا کچھ نہ کیا ——— لیکن اس پھرتی و چالاکی سے کیا کہ کسی کو اس کی غیرتِ کفر کا احساس تک نہ ہوا ——— وہ تخریب انسانیت بن کر ابھرا اور ہاتھ کی صفائی دکھا کر چلتا بنا ——— سب دیکھتے رہ گئے، وہ اپنا کام کر گیا ——— نام کو یہ ملک لادینی ہے اور دنیا کے اکثر ممالک لادینی سیاست پر یقین رکھتے ہیں (ماسوائے پاکستان کے جس کی بنیاد خالص دینی اور نظریاتی ہے) لیکن عقلیت پرستی کے اس دور میں بھی دین ایک زندہ حقیقت ہے ——— دین کی محبت رگ و پے میں جاری و ساری ہے ——— خواہ منہ سے کتنی لادینیت کا پرچار کیا جائے۔

کہتے ہیں کہ ہم کو شکست ہوئی ——— لیکن فتح و شکست تو اس وقت ہوتی ہے جب دو حریف ایک مشترکہ مقصد کے لئے برسرِ پیکار ہوں ——— دو بھائیوں کا جھگڑا تھا گھر کی لڑائی تھی ——— گلی تک آواز پہنچی ——— لوگ مدد کو دروازے تک پہنچے ——— شدہ شدہ بازار تک خبر پہنچی اور حمایتی چڑھ دوڑے، دیکھتے ہی دیکھتے گھر میں گھس گئے ——— دونوں بھائی ہکا بکا رہ گئے ——— ہائے یہ کیا ہوا ——— گھر لٹ گیا ــــ

متاعِ راحت و شادیٔ ما بغارت داد
چہ فتنہ بود کہ ناگہ در آمد از درِ ما

قزاقی اور سفاکی کا نام فتح و نصرت نہیں ——— یہ غیرتِ کفر کی کرشمہ سازیاں تھیں جو شاید تاریخِ اسلام میں چشمِ مسلم نے کبھی نہ دیکھی ہوں گی۔

عید یا وعید کہتے ہیں عید مسرتوں کا دن ہوتا ہے ——— لیکن جن کے دل داغدار اور سینے پاش پاش ہیں، ان سے پوچھئے کہ یوم عید یوم عید ہے یا یوم وعید ہے ——— غم زدہ انسان کے لئے ہر خوشی پیغام غم و الم ہے ——— لوگ خوش ہو ہو کر رقص کر رہے ہیں اور وہ ظلمت غم میں کھویا ہوا ہے ——— اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا

چھپایا ہوا ہے ؎

مرے غم خانۂ مصیبت کی

چاندنی بھی سیاہ ہوتی ہے

بیس برس ہوتے ہیں ـــــ نوعمری کا زمانہ تھا ـــــ عیدگاہ میں نمازِ عید کے لئے جب لوگ ایک ایک سے گلے مل رہے تھے، ایک غمزدہ انسان تنہا کھڑا ایک ایک کا منہ تک رہا تھا ـــــ مگر کوئی اس کی طرف ملتفت نہ تھا ـــــ اس سے رہا نہ گیا، بیساختہ پکار اٹھا :

"ارے مجھ سے تو ملو ـــــ میرا کوئی نہیں"

اس کی چیخ نکل گئی ـــــ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا ـــــ

نوعمری کے اس زمانے میں جب کہ فضاؤں میں خوشیاں ہی خوشیاں نظر آتی ہیں، اس طلب و آرزو پر ہنسی آئی ـــــ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور نشترِ غم سے سینہ چھلنی ہونے لگا، اُس غمزدہ کے الفاظ رہ رہ کر کانوں میں گونجتے اور تیر و نشتر بن بن کر چبھتے ہیں ـــــ

اللہ اللہ اس کارخانۂ ہستی میں انسان کو رفتہ رفتہ اکیلا کر دیا جاتا ہے ـــــ اگر زندگی کی منزلِ اولیں پر تنہا کر دیا جاتا تو اس کا کلیجہ پھٹ جاتا ـــــ نہ معلوم کتنے غم رسیدہ ہیں، عید کے دن جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں ـــــ اور کتنے آفت رسیدہ ہیں، عید کے دن وہ مسکرانے پر مجبور کئے گئے ہیں مگر ان کے دل میں تو آگ سلگ رہی ہے، انگارے دہک رہے ہیں، وہ سوزش و جلن ہے کہ آتشِ دوزخ میں بھی نہ ہوگی ؎

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں

سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

لیکن مردانگی یہ ہے کہ دل میں جہنم ہو تو چہرے پر جنت ؎

عشق دانی چیست لب برخندہ کردن نزدِ خلق ‌ ‌ ‌ ‌ بے تغافل آہ و افغاں آہ و افغاں داشتن

بچپن میں جب کسی بزرگ کو غمزدہ دیکھتے تو تعجب ہوتا تھا کہ یہ خوشی کیوں نہیں ہو رہے ہے ——— یہ تو عید کا دن ہے ——— خوشیوں کا دن ہے ——— اچھے اچھے کپڑے پہنے جا رہے ہیں ——— خوشبوؤں سے فضائیں معطر و معنبر ہیں ——— ایک دوسرے کے ہاں جا رہے ہیں ——— معانقے ہو رہے ہیں، مصافحے ہو رہے ہیں ——— عیدیاں مل رہی ہیں ——— سوئیاں، کھیریاں، مٹھائیاں کھائی جا رہی ہیں ——— غرض ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہیں ——— لیکن یہ معلوم تھا کہ یہ بزرگ ایک عظیم حادثے سے دوچار ہو چکے ہیں ——— ان کا دل داغ داغ ہے ——— ان کا سینہ چاک چاک ہے ——— آہ وہ کاروانِ رفتہ کے ماتم میں سوگوار ہیں ——— دل کہتا ہے کہ وہ بھی ہوتے تو کیا اچھا ہوتا ——— غم کہتا ہے کہ قانونِ قدرت یہی ہے کہ جانے والے آنے والوں کو گریاں چھوڑ جاتے ہیں ؎

یارانِ رفتہ ہم سے منہ اپنا چھپا گئے
معلوم بھی ہوا نہ کدھر کارواں گیا

آلام آلام معارِ حیات ہیں ——— شاید اس نظر سے ہم نے نہیں دیکھا ورنہ آلام سے نفرت نہ ہوتی، پیار ہوتا ——— ہم مصیبتوں سے بھاگتے ہیں مگر وہ ہم کو بنانے سنوارنے آتی ہیں ——— وہ خانۂ حیات ہیں ——— وہ بہارِ زندگی ہیں ——— ہاں عذابِ الٰہی والی بات الگ ہے اور اگر دیکھا جائے تو یہ عذاب بھی دوسروں کے لئے عبرت ہے ——— دوسروں کا کارساز ہے ———

تاریخِ عالم دیکھ جائیے مشاہیرِ عالم میں کوئی ایسا نظر نہ آئے گا جو غم و الم سے بیگانہ رہا ہو ——— ان حضرات پر ایسی ایسی مصیبتیں آئیں کہ ہم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے ——— سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر جتنی مصیبتیں آئیں سطحِ زمین پر کسی پر نہ آئی ہونگی ——— عظمت و الم کا چولی دامن کا ساتھ ہے ——— رہبرِ منزل سے پوچھئے

کہ منزل تک پہنچتے پہنچتے اس پر کیا کچھ گذرتی ہے ——— منزل تک پہنچ نہیں سکتا جبتک مصائب کو خوش آمدید نہ کہے ——— بلکہ اگر بلند ہمت اور عالی حوصلہ ہے تو اس کو دعوت دینی چاہیئے ———

لیکن ہم خوشیوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں ——— یہ حباب کی طرح اُبھرتی اور مٹتی رہتی ہیں ——— ہاتھ نہیں آتیں ——— قابو میں نہیں رہتیں ——— دلفریب ہیں ——— مسرت کے ماروں کو رواں دواں رکھتی ہیں اور بالآخر ان کو موت کی آغوش میں جا سلاتی ہیں ———

وہ شعراء جنہوں نے غم کے گیت گائے ہیں اور مصیبتوں کو نعمتِ عظمیٰ سمجھا ہے، وہ عظمتِ غم والم سے ناواقف نہ تھے ——— جبھی تو فانی کہتا ہے ؎

میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

اور اقبال کہتا ہے ؎

کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو
یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

ہاں اے رفیقو! اے ساتھیو! غم والم سے نہ بھاگو ——— اِس کو خوش آمدید کہو ——— آنکھوں پر بٹھاؤ ——— سینے سے لگاؤ کہ یہ سینے سے لگانے ہی کے قابل ہے ؎

دردِ عشق اے میہمانِ جانِ من
باش وجہِ رونقِ ایں خانہ باش

تمغات وخطابات دنیا کے بادشاہوں، نوابوں، راجاؤں اور سپہ سالاروں کی تصویریں دیکھیئے ان کے جسمِ فانی پر تمغات قطار اندر قطار

نظر آئیں گے ——— ذرا دیکھئے تو سہی ننھی سی جان پر کیا کیا آویزاں ہے اور یہ کس مصیبت میں مبتلا ہے ——— ؟ کیا ایک تابناک سیرت کو ان تکلفات کی ضرورت ہے ——— ہرگز نہیں ہرگز نہیں ——— ! وہ خود تمغۂ دو عالم ہے ——— اس کو کسی تمغے کی ضرورت نہیں ———

دیکھو دیکھو مدینہ کی بستی میں ایک غریب نواز بیٹھا ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) ——— اس کے غلاموں نے تاج شاہی کو روندا ہے ——— اس کی ہیبت سے عالم لرزاں و ترساں ہے ؎

ظاہر میں غریب الغربا، پھر بھی یہ عالم
شاہوں سے سوا سطوتِ سلطانِ مدینہ

ہاں اُس غریب نواز کی ادائے دل نواز نے سب شاہی ٹھاٹ باٹ خاک میں ملا کر رکھ دیئے ——— اُس کے جسمِ نازنیں پر ایک کملی ہے ——— کملی پر کوئی تمغہ نہیں ——— پیوند ہی پیوند ہیں مگر پھر اندر باہر سے چمک رہا ہے اور اس کی چمک دمک سے عالم کی نگاہیں خیرہ ہو رہی ہیں ——— اُس کے پاس نہ کوئی تمغہ ہے اور نہ کوئی خطاب اور نہ اس کو تمغہ و خطاب کی ضرورت ——— وہ رسولِ رب العالمین ہے ——— رحمۃ للعالمین ہے ——— وہ صرف خدا کی عطا پر جی رہا ہے اور اسی نے اس کو وہ عروج بخشا ہے کہ مہ و پروین کو اس نے روندا ہے ——— وہ صرف رضائے الٰہی کا طالب ہے ——— یہی وہ تمغہ ہے جس کے بعد کسی تمغے کی ضرورت نہیں ——— اُس کے پاس کچھ نہیں لیکن سب کچھ ہے ——— وہ دنیا سے بے نیاز ہے اور دنیا والوں کے لئے ایک مثالی نمونہ ——— کامل نمونہ ——— زندۂ جاوید نمونہ ——— اس نے یہ راز بتایا کہ سیرت تابناک ہو تو پھر پیوند لگے کپڑے ہزار تمغوں اور سینکڑوں خطابات پر بھاری ہیں۔

اور دیکھو دیکھو اس کا غلام و فاشعار فاروقِ باوقار (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) پیوند لگے کپڑے پہنے ہے اور مسندِ خلافت پر بیٹھا ہے ——— عالم میں غلغلہ بپا ہے ——— ایک ایرانی سیاح لکھتا ہے کہ لنکا سے دو تین ہندو ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے مدینہ پہنچے اور اس خلیفۂ رسول کا حال دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے ——— مگر اس کی سادگی کا وہ نقش دل پر لے گئے کہ جب لنکا جا کر یہ ماجرا سنایا تو سب نے (مشرک و کافر ہوتے ہوئے) فاروقِ اعظم کی یاد میں پیوند لگے کپڑے پہنے (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ——— یہ تمغے نہ تھے ——— یہ پیوند تھے لیکن دیکھو دیکھو نگاہِ اغیار میں یہ تمغے بن گئے ——— سب لگا رہے ہیں اور خوشی خوشی لگا رہے ہیں۔

دنیوی تمغات و خطابات دنیا ہی میں رہ جائیں گے ——— آخرت میں کس کام آئیں گے؟ ——— وہاں نیک اعمال ہی کام آئیں گے ——— لیکن غفلت کا کچھ ایسا پردہ پڑا ہوا ہے کہ تمغات و خطابات کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہیں ——— اور جب یہ ملتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ دولتِ کونین مل گئی ——— غفلت کی انتہا ہے کہ قبروں کے کتبوں پر ان تمغات و خطابات کو کندہ کرایا جاتا ہے حالانکہ یہاں ان کا ذکر و فکر عبث ہے ——— یہاں پکارنے والا پکار رہا ہے ——— خبردار! یہاں ڈگریوں، تمغوں اور خطابوں کا ذکر نہ کرنا ——— یہ میدانِ محشر ہے ——— ہاں نیک عمل ہے تو ضرور پیش کرو، پورا پورا صلہ دیا جائے گا ——— ورنہ تمہارے اعمال تمہارے منہ پر مار دیے جائیں گے ———

اگر انسان ذرا بھی عقل سے کام لے، وہ تمغات و خطابات کے پردۂ فریب کو چاک کر کے صحرا میں نکل کھڑا ہو اور پھر وہ خوبی پیدا کرے جو ہزار تمغوں پر بھاری ہو ——— جن کو خدا نے عقل دی، انہوں نے تختِ شاہی چھوڑا ——— قلمدانِ وزارت چھوڑا اور ——— پھر فقیری میں وہ بات پیدا کی جو شاہی میں بھی میسر نہ آسکی۔

مَبلغِ علم

انسان کتنا کچھ حاصل کرلے لیکن حقیقۃً کچھ حاصل نہیں ہوتا ——— بہت ہاتھ پیر مارے تو ساحل تک پہنچ پاتا ہے ——— وہ بھی شاذونادر ——— ذرا علم کی وسعت تو دیکھئے مولائے کریم نے رسولِ رحیم علیہ التحیۃ والتسلیم کو ہدایت فرمائی :

قُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا

——— وہ رسولِ رحیم جن کے علم کی یہ شان ہے کہ سوائے خدا کے مخلوق میں کسی کا علم ان کے علم پر محیط نہیں ——— لیکن پھر بھی ازدیادِ علم کے لئے دعا پر دعا مانگ رہے ہیں ——— اور اسی لئے امت کو یہ ہدایت فرما رہے ہیں :

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ إِلَى اللَّحْدِ

مہد سے لحد تک علم حاصل کرو کہ علم کی کوئی انتہا نہیں ——— وہ صفتِ خالقِ کائنات ہے ——— لم یزل ولا یزال ہے ———

بڑے سے بڑا عالم بھی اگر اپنے علمی سرمایہ کو پیش کرے تو وہ اتنا بھی نہیں کہ جتنا سمندر کے سامنے ایک ذرا سی بوند ——— چند کتابوں اور چند گنی جنی کتابوں کے سوا اس کو آتا ہی کیا ہے ——— درسِ نظامی کی سند ہو یا ایم اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں ——— لوگ ان کو بہت کچھ سمجھتے ہوں لیکن حقیقت میں کچھ بھی تو نہیں ——— ہزاروں زبانیں ہیں اور ہزاروں علوم و فنون ——— ایک زبان کے کسی خاص مضمون کا عارف تمام زبانوں کے جملہ علوم و فنون کا عارف نہیں بن سکتا ——— اور دیکھا جائے تو اس مضمون میں بھی اُس کو کما حقہٗ تبحر حاصل نہیں ہو پاتا ——— اگر علم کی سچی طلب ہے تو ہر منزل پر خود کو تشنہ ہی پائے گا اور جوں جوں آگے بڑھتا جائے گا، حیرت ہی بڑھتی ہی جائے گی۔

شجرِ علم کا علم تو بڑی بات ہے ——— ایک شاخ کے ایک پتے کی ایک رگ پر بھی تو ہمارا ہاتھ نہیں پہنچ پاتا ——— پھر شجرِ علم میں پھوٹے نہیں سماتے ——— سچ پوچھئے تو یہ جاننے کے لئے کہ ہم کچھ نہیں جانتے اور کچھ نہیں جان سکتے، بہت کچھ جاننے کی ضرورت

ہے ——— اعترافِ جہل کمالِ عرفان کی علامت ہے ——— جو جہل تک نہیں پہنچے وہ کمال تک نہیں پہنچے ——— اسی لئے حریمِ عشق میں عرفاء کی صدائیں کانوں سے ٹکرا ٹکرا کر ہم کو خبردار کر رہی ہیں :

مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ

اپنی مدد آپ

اپنی مدد آپ ——— ایک اچھا اصول ہے ——— ہمارے اسلاف اور ہمارے بزرگوں نے یہی کر کے دکھایا ہے ——— فاروقِ اعظم اونٹ پر سوار جا رہے ہیں ——— چابک گر گیا ——— راہگیروں سے نہ مانگا ——— سواری کو روکا، نیچے اتر کر خود اٹھایا ——— کہ طلب بہر حال طلب ہے ——— دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے افضل ہے ——— اور سنیئے ——— بیت المال سے ایک اونٹ گم ہو گیا ——— مدینہ کی گلیوں میں بنفسِ نفیس تلاش کرتے پھر رہے ہیں ——— شرفاءِ مدینہ نے کہا آپ نے خود کیوں تکلیف کی کسی غلام کو بھیجدیا ہوتا ——— معلوم ہے فاروقِ اعظم نے کیا جواب دیا ؟ ——— آپ نے فرمایا :

"اللہ اکبر ! کیا مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی غلام ہے ؟"

اللہ اللہ ! وہ بات کہہ دی کہ پندارِ شاہی اور زعمِ افسری کو خاک میں ملا کر رکھدیا ——— لیکن ہمارے معاشرے میں شاہانہ ٹھاٹ باٹ اب تک قائم ہے ——— کارداں کہاں سے کہاں نکل گیا لیکن ہم ظلمتوں کی نذر ہو گئے ———

دفتروں میں دیکھئے ——— کالجوں میں دیکھئے ——— کوچہ و بازار میں دیکھئے ——— گھروں میں دیکھئے ——— بہت سے "اپاہج" نظر آئیں گے ——— دفتر میں صفائی کرنا اور نیچے گری ہوئی چیز اٹھا کر دینا چپڑاسی کا کام ہے ——— کالجوں اور سکولوں میں سینکڑوں طلبہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں ——— ساری ذمہ داری ایک دو چپڑاسیوں اور ایک دو مالیوں پر ہے ——— طلبہ کا کام صرف لکھنا پڑھنا ہے

——— کہ یہ کام تو پست کرتے تھے ——— اب تو کھیلنا، کودنا اور شرارتیں کرنا ہے ——— مستثنیات کی بات الگ ہے ——— ہاں تو ان کے لئے اپنا ڈیسک اور میز کرسیاں صاف کرنا کسرِ شان ہے ——— یہ تو بڑی چیز ہے کالج کے لان اور سبزہ زار میں پتا ادھر سے ادھر نہیں کر سکتے ——— ہاں گل چینی کا کام اچھا آتا ہے ——— اجڑ دانا ہو تو منٹوں میں اجاڑ دیتے ہیں ——— مستثنیات کی بات الگ ہے۔

کوچہ و بازار میں صفائی کا خیال رکھنا صرف حلال خوروں کا کام ہے، ہمارا کام کوڑا پھیلانا ہے ——— گھروں میں جہاں سارا کام نوکروں کے سر ہے وہاں بھی صفائی کا خیال رکھنا نوکر کا کام ہے ——— گھر والوں کا کام چیزیں الٹ پلٹ کرنا اور کوڑا پھیلانا ہے ——— بالخصوص مردوں کا کام یہی ہے ——— وہ دفتروں میں ملازمت کرتے ہیں، گھر پر چھٹی گزارتے ہیں ——— نازک مزاجی کی انتہا ہے ——— ذرا صاحب بہادر کو دیکھئے ایک ننھا سا فائل چپڑاسی لئے پیچھے پیچھے رواں دواں ہے اور وہ آگے آگے شاہانہ آن بان کے ساتھ چلتے جا رہے ہیں ——— بُرا ہو اس جھوٹی شان و شوکت کا جس نے اچھے خاصے توانا و تندرست انسان کو اپاہج بنا کے رکھ دیا ——— خلافتِ فاروقی میں مدینے کے جج بازار میں جا رہے ہیں ——— آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے کچھ لوگ ——— سرِ بازار جج صاحب کے ایک درّہ رسید کیا اور فرمایا:

"یہ آگے آگے چلنا تمہارے لئے فتنہ اور پیچھے چلنے والوں کے لئے ذلت و رسوائی ہے۔"

اللہ اللہ! احترامِ انسانیت کا کیا درس دیا ہے ——— جب تک ابنائے جنس کا دل میں احترام نہ ہو اور جب تک عزتِ نفس کا پاس و لحاظ نہ ہو، انسان اپنی مدد آپ نہیں کر سکتا ——— وہ عزت اسی میں سمجھتا ہے کہ اپنے کاموں کے لئے دوسروں سے مدد لی جائے ——— حالانکہ اس میں عزت نہیں سراسر ذلت ہے ———

قربان جائیے ان نفوسِ قدسیہ کے جنہوں نے احترام انسانیت کا درس دیا اور عزتِ نفس کا سبق پڑھایا ـــــــ اے یارانِ وطن اور اے فرزندانِ قوم! ہوش سنبھالو خود اعتمادی پیدا کرو ـــــــ خود کام کرنے کی عادت ڈالو ـــــــ اس کو عار نہ سمجھو ـــــــ یہ سنتِ رسول کریم ہے لیکن اگر تمہیں سنت سے چڑ ہے (معاذاللہ، استغفراللہ) تو پھر سن کر ملک چین اسی سنت پر عمل پیرا ہو کر پچیس سال کے اندر اندر دنیا کی تیسری بڑی طاقت بن چکا ہے ـــــــ اور ہم نے اس مدت میں اپنی سی قوت بھی گنوا دی ہے اور اب تعمیرِ نو کی فکر میں لگے ہیں ـــــــ لیکن جب تک خود ہاتھ پیر نہ ہلائیں گے تعمیرِ نو مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے ـــــــ پڑھو پڑھو کہ زمانہ قیامت کی چال چل رہا ہے۔

صلہ رحمی لڑکپن میں یہ حدیث سنی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز صحابہ سے فرمایا "کیا تم کو وہ چیز نہ بتا دوں جو ارکانِ پنجگانہ سے بھی افضل ہے؟" ـــــــ صحابہ نے عرض کیا "کیا ایسی بھی کوئی چیز ہے جو نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ وغیرہ سے افضل ہو؟" ـــــــ فرمایا "ہاں وہ صلہ رحمی ہے" ـــــــ ع

دل بدست آور کہ حجِ اکبر است

یہ حدیث سن کر تعجب ہوتا تھا کیونکہ لڑکپن کے اس دور میں نماز، روزہ مشکل معلوم ہوتا تھا ـــــــ ہاں ملنے جلنے میں بہت لطف آتا تھا ـــــــ جس عزیز کے ہاں جاتے، روپے پیسے ملتے ـــــــ اور عید پر تو سبحان اللہ ماشاءاللہ! ـــــــ ایسی مزیدار چیز کو افضل ترین بتانا تعجب خیز تھا ـــــــ افضل ترین ہونے کا استحقاق اسی کو ہے جو مشکل ترین ہو ـــــــ ــ ــ

بچپن و لڑکپن کا عہدِ شاہی بیت گیا ـــــــ دورِ شباب آیا ـــــــ کچھ جھٹکے لگے ـــــــ ہوش آیا اور دل نے گواہی دی کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بجا فرمایا کہ صلہ رحمی افضل ترین عمل ہے ـــــــ واقعی یہی مشکل ترین ہے ـــــــ

جوں جوں قدم آگے بڑھتے گئے ارشادِ مصطفوی کی صداقت عیاں ہوتی چلی گئی ـــــ ہاں ہاں ـــــ کہ

حسبا دل کہ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

نماز کے لئے ایک وقت ہوتا ہے ـــــ روزے کے لئے بھی ایک خاص مہینہ ہوتا ہے ـــــ حج کے لئے بھی ایک زمانہ ہے ـــــ جہاد کے لئے بھی ایک وقت ہے ـــــ زکوٰۃ کے لئے بھی ایک وقت ہے ـــــ غرض ان فرائضِ پنجگانہ میں کوئی فرض ایسا نہیں جس کا عمل ہر وقت جاری رہے ـــــ جو ہمیشہ نفس و روح کو کشمکش میں مبتلا رکھے ـــــ لیکن ہاں صلہ رحمی ـــــ اور وہ بھی بدخواہوں اور بدبینوں سے ـــــ ایک ایسا عمل ہے جو تلوار سے تیز اور بال سے باریک ہے ـــــ جو ہر وقت کشمکش میں مبتلا رکھتا ہے کہ

جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے!

قرآنِ کریم نے تعزیرات میں بھی صلہ رحمی کے جذبے کو پیشِ نظر رکھا ہے ـــــ بے شک اہلِ دنیا کے لئے رخصت ہے لیکن اہلِ دل کے لئے عزیمت ہی عزیمت ہے ـــــ جہاں رخصت ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ عزیمت کا درس دیا گیا ہے ـــــ کان کے بدلے کان ـــــ آنکھ کے بدلے آنکھ ـــــ ناک کے بدلے ناک جان کے بدلے جان ـــــ بیشک عقلِ انسانی اور فطرتِ انسانی اسی بدلے کی متقاضی ہے ـــــ لیکن جہاں یہ رخصت ہے وہاں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اگر معاف کر دو تو کیا کہنے!

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی کر کے دکھایا ـــــ طائف کے بازاروں میں لہولہان کیا گیا لیکن آپ نے اپنے نفس کی خاطر کسی کے خون کا ایک قطرہ بھی نہ بہایا ـــــ جنگِ احد میں دندان شہید ہو گئے۔ لوہے کا خود چہرۂ مبارک میں

دھنس گیا ——— مگر آپ نے کسی کے دانت نہ توڑے اور کسی کا سر نہ پھوڑا ——— بلکہ دشمن کو بھی معاف کر دیا ——— فتح مکہ کے بعد معافی کا عام اعلان رہتی دنیا تک یاد رہیگا ——— یہ ہے صلہ رحمی ——— یہ ہے دلداری ——— کیا دنیا ایسی کوئی نظیر پیش کر سکتی ہے؛

اے یارانِ وطن آؤ ہم سب گلے ملیں اور اس عزم کے ساتھ آگے بڑھیں کہ آج کے بعد کوئی کسی کا دل نہ دکھائے گا ؎

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

دل و دماغ دنیا نے یہ بتایا کہ دماغ ایک عظیم قوت ہے ——— مگر اسلام نے یہ بتایا کہ دل ایک عظیم قوت ہے ——— اس کی منزل حیرت ہے، اس کی منزل یقین ہے، اور یقین، حیرت سے بہت آگے ہے ؎

اک دانشِ برہانی، اک دانشِ نورانی
ہے دانشِ برہانی حیرت کی فراوانی

بیشک دماغ قدرتِ الٰہیہ کا اعجوبہ ہے ——— ننھے سے بچے میں اس اعجوبۂ روزگار کی کرشمہ سازیوں کا پتا نہیں چلتا ——— لیکن جوں جوں وہ بچہ بڑا ہوتا جاتا ہے، دماغ گل کھلاتا جاتا ہے ——— ذرا غور تو کریں کہ وہ ننھا سا بچہ دیکھتے دیکھتے چاند پر چڑھ دوڑتا ہے ——— فکر کی جولانیوں کی کوئی حد ہے؛ ——— دماغ تو پھر بھی ایک بہت بڑی چیز ہے ——— معمولی بیج کو دیکھئے، ایک عظیم قوت اس میں نہاں ہے ——— سینہ گیتی چیر کر اچانک نکل پڑتا ہے ——— بڑے سے بڑا پہلوان بھی زمین میں دفن ہونے کے بعد زمین سے نہیں نکل سکتا ہے ——— لیکن یہ بڑی آب و تاب کے ساتھ نکلتا ہے ——— دفن ہونے کے بعد اس طرح نکلتا ہے جس طرح میدانِ حشر

میں مردے اٹھیں گے ——— ایک بیج کی کیا اوقات ہے! مگر کیسے کیسے گل بوٹے اور برگ و ثمر اس میں سے نکلے پڑتے ہیں اور برسوں نکلتے رہتے ہیں ——— بیج کیا ہے، چشمۂ حیات ہے! ——— بات کہاں سے کہاں نکل گئی ——— دماغ کی بات کر رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ دل، دماغ سے کہیں زیادہ عظیم ہے ——— دماغ کی پہنچ صرف محسوسات و مشاہدات تک ہے لیکن وہ جو محسوسات سے بالاتر ہے اور دیکھنے اور سننے میں نہیں آتا، دل وہاں کی خبر لاتا ہے ——— دل والوں کے حالات پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ حضرات پلک جھپکتے ہی کہاں سے کہاں پہنچ گئے ——— اور آن کی آن میں وہ کچھ دیکھ لیا جو دماغ والوں نے صدیوں میں بھی نہ دیکھا۔

یادِ رفتگاں بچپن کا زمانہ بے خودی کا زمانہ ہوتا ہے ——— بچے کو دیکھو مست و بے خود چلتا چلا جاتا ہے ؎

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

——— اے جانے والے تجھ پر ہزار ہزار رحمتیں ہوں! ——— تو محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پیارا ہے ——— تجھے گود یوں میں اٹھایا ہے ——— تجھے کندھوں پر بٹھایا ہے ——— تو ہر ایک دل کا سہارا ہے ——— تو غم و الم کا سہلاوا ہے ——— تو شاہِ وقت ہے ———

ہاں بچپن کے بعد لڑکپن کا دور شروع ہوتا ہے ——— یہ بھی بے خودی کا زمانہ ہے ——— خوشیاں زیادہ معلوم ہوتی ہیں اور غم کم کم ——— اور جسے دورِ شباب کہتے ہیں ——— دورِ سرمستی و سرشاری ——— یہ درحقیقت مستی کا دور نہیں، ہشیاری کا دور ہے ——— جو مست ہوا تباہ ہوا ——— جو ہشیار رہا کامران رہا ——— لیکن اس ہشیار کو غم دوراں کھائے جاتا ہے ——— کہے تو کیا کرے! ——— خیر جوں توں کر کے وقت گزرتا جاتا ہے ——— شباب ڈھلنے لگتا ہے

—— آنکھیں کھلنے لگتی ہیں —— ماضی کی پشیمانیوں، حال کی پریشانیوں اور مستقبل کی حیرانیوں میں انسان کھو سا جاتا ہے ؎

بہ احساسِ ہستی مدارِ ادراکِ ہستی
مدھر مل پڑا ہوں چلا جا رہا ہوں

دوست احباب ایک ایک کر کے اٹھنے لگتے ہیں —— اور دیکھتے ہی دیکھتے مجلس درہم برہم ہو کر رہ جاتی ہے اور انسان تنہا رہ جاتا ہے —— زندگی کے یہ تلخ تجربات بتاتے ہیں کہ اگلوں نے پچھلوں کے دل کیسے داغدار کئے! مگر وہ ہماری خاطر مسکراتے تھے —— ان کے دل میں جہنم روشن تھی —— بڑی ہمت کی بات تھی، بڑے حوصلے کا کام تھا ——

لیکن ہمارا غم ان کے غم سے دوگنا ہے —— بلکہ اس سے بھی بڑھ کر —— ماضی میں جو کوئی اٹھتا اس کا جانشین مرہم کا فوری ہوتا —— لیکن اب جانے والے جا رہے ہیں —— مسندیں ویران ہو رہی ہیں —— علم و حکمت کا بازار سرد ہو چکا ہے —— ایک ایک کا منہ تکتے ہیں —— کوئی نظر نہیں آتا ؎

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا!
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

شکر رنجیاں اور تلخیاں

دنیا میں کتنے دن رہنا ہے؟ —— زندگی کتنی ہے؟ —— دو روزہ —— اور وہ دو روز بھی تعمیرِ آرزو اور انتظارِ آرزو میں گزر جاتے ہیں —— تکمیلِ آرزو کا وقت ہی نہیں آتا ؎

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

کسی نے کیا خوب کہا ہے —— "زندگی کیا ہے؟ نماز و اذان کا درمیانی وقفہ"

——— غور کیجئے تو کہنے والے نے کیسی مل گتی بات کہی ہے ——— بچہ ہوتا ہے ایک کان میں اذان دی جاتی ہے دوسرے کان میں اقامت ——— بس نماز کی کسر رہ جاتی ہے سو رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آجاتا ہے اور نماز بھی ہو جاتی ہے ——— لیکن اذان و اقامت کے بعد نماز کا یہ انتظار کرنے والا جھگڑنے پر کیسا کمربستہ نظر آتا ہے، بات بات پر لڑائی ——— قدم قدم پر لڑائی ———

پھر ذرا غور کیجئے ——— زندگی کیا ہے ——— ایک حباب دم کشیدہ جو دم میں پھول پھٹتا ہے ؎

اس موج خیز دہر میں ہم کو قضا نے آہ
پانی کے بلبلے کی طرح سے مٹا دیا

نہیں زندگی کیا ہے ایک چنگاری ہے جو بھڑک کر آن کی آن میں ختم ہو جاتی ہے ؎

ہم تو چمکتے ہی ہوا ہو گئے
مثل شرر دم میں فنا ہو گئے

نہیں نہیں وہ ایک عارضی بہار ہے ——— وہ فریب نظر ہے ؎

ایک جھونکے میں ہے اِدھر سے اُدھر
چار دن کی بہار ہے دنیا

زندگی ایسی سیماب پا ہے لیکن پھر بھی ہم آپس میں لڑتے مرتے ہیں ——— یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دنیا نہیں کوئی میدانِ جنگ ہے جہاں ہر شخص دست بہ گریباں ہے ؎

ہر جگہ جنگ ہر جگہ ہے نزاع
عرصۂ کارزار ہے دنیا

دنیا کو خدا نے جنت بنایا لیکن ہم نے لڑ لڑ کے اس کو جہنم بنا لیا ——— لیکن ہاں یہ جہنم پھر جنت بن سکتی ہے ——— صبر و استقلال کی بات ہے ہوش و خرد کی بات ہے ———

جذبۂ مروت و محبت کی بات ہے ؎

آسائشِ دو گیتی تفسیرِ دو حرف است
با دوستاں مروت با دشمناں مدارا

بڑی بڑی جنگیں تو فطرتِ انسانی کے تقاضے معلوم ہوتی ہیں ——— ازل سے ہو رہی ہیں، ابد تک ہوتی رہیں گی ——— مسئلۂ خلافت میں فرشتوں نے اسی دلیل سے استحقاقِ خلافت کو رد کرنا چاہا تھا ——— تو یہ جنگیں تو ہوتی رہیں گی اور یہ خون بہتا رہے گا ——— لیکن یہاں بات معمولی معمولی شکر رنجیوں کی ہے ——— موت کی خبر کیوں نہ دی ——— شادی میں کیوں نہ بلایا ——— ولیمہ میں بلایا تھا تو نکاح میں کیوں نہ بلایا ——— ہم نہ گئے تھے تو ہمارا حصہ کیوں نہ آیا ——— وہ ہمارے گھر کیوں نہیں آئے ——— انہوں نے ہم کو خط کیوں نہ لکھا ——— وغیرہ وغیرہ ——— ان شکایتوں کی کوئی حد ہو تو ذکر بھی کی جائیں ——— لامحدود و لامتناہی ہیں ——— لیکن یہ اسی وقت تک ہیں جب تک ہماری آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں ——— پردے ہٹتے ہی ساری شکایتیں ختم ہو جاتی ہیں اور انسان کو اپنی پڑ جاتی ہے کہ اس احکم الحاکمین کے حضور جائے گا تو کیا لے کر جائے گا ——— جب یہ پوچھا جائے گا کہ ہم نے اپنے انعامات سے تجھ کو نوازا اور تو مخلوقِ خدا سے لڑتا پھرا؟ ——— بتا کیا جواب دو گے؟ ——— آؤ، اس دربار میں حاضری کی تیاری کریں ——— سب کا دل رکھیں، کسی کا دل نہ دکھائیں ——— اور اسی سے دل لگائیں جس کی محبت دو عالم سے بے نیاز کر دیتی ہے ؎

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

جتنا اس سے دور ہوتے جائیں گے، غیر سے تعلق بڑھتا جائے گا اور شکایتوں کے

انبار کے انبار گنتے جائیں گے ـــــ اور جتنا اس سے تعلق قوی ہوتا جائے گا، غیر کا تعلق ختم ہو جائے گا اور شکایتیں خود بخود رفع ہو جائیں گی ؎

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ

موت کا سناٹا موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا ـــــ مگر وہ چیخ رہی تھی ـــــ وہ اپنی جان ہتھیلی پر لے کر نکلی تھی ـــــ دکھی دل تھی ـــــ خانماں برباد تھی ـــــ گھر بار لٹا کر آئی اور شاید موت کی تلاش میں سرگرداں تھی ـــــ موت اس کے سر پر منڈلا رہی تھی مگر حکمِ ربی کی منتظر تھی ـــــ وہ چیخ چیخ کر کچھ کہتی اور پھر خاموش ہو جاتی ـــــ پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگتی ـــــ سب موجود تھے مگر اپنے اپنے گھروں میں بند ـــــ کوئی کسی کا مونس و غمخوار نہ تھا ـــــ نفسی نفسی کا عالم تھا ـــــ گولیوں کی سنسناہٹ ـــــ بموں کی گھڑگھڑاہٹ ـــــ پھر ایک خاموشی اور اس خاموشی میں اس غم رسیدہ کی آواز ـــــ

"بھیّا پک رہا ہے، بھیّا پک رہا ہے، اماں میں بھیّا کھاؤں گا" ـــــ وہ کہتی جاتی اور روتی جاتی ـــــ

اُس وقت نوعمری کا زمانہ تھا، اس آواز پر کچھ ہنسی سی آئی ـــــ لیکن آج رہ رہ کر جب یہ آواز کانوں میں گونجتی ہے تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے ـــــ اپنا لختِ جگر ہو تو اس کی جدائی کے تصور ہی سے دل لرزنے لگتا ہے ـــــ پھر جدائی کی قیامت جدائی کے ساتھ ہے ـــــ ستمبر ۱۹۴۷ء کے خونریز ہنگاموں میں نہ معلوم کتنی ماؤں کی گودیں خالی ہو گئیں ـــــ ان کے بچے دہکتی ہوئی آگ میں جھونک دیئے گئے ـــــ ان کے لختِ جگر نیزوں کی انیوں پر چڑھا دیئے گئے ـــــ ہاں یہ دلی کی ایک اجل رسیدہ اور غم رسیدہ تھی، جس کا بچہ پامالِ ستم ہو چکا تھا ـــــ اس کا

گھر لٹ چکا تھا ——— وہ اپنے ہی وطن میں وطن سے بے وطن ہو گئی تھی ——— وہ اپنے ہی گلی کوچوں میں غریب الدیار ہو چکی تھی ——— اس کو لٹے گھر کی پرواہ نہ تھی ——— اسکو صبر تھا اور صرف اپنے لختِ جگر کی چاہ تھی ——— اس کی آنکھیں اشکبار تھیں ——— اس کا دل داغدار تھا ——— اس کا سینہ چاک چاک تھا ——— وہ جان بکف شب کی تاریکی میں سڑک پر چلتی چلی جا رہی تھی ——— دھاڑیں مار مار کر روتی اور دل کے بہلانے کو بیچ کے بول بولتی :

"بچا پک رہا ہے، بچا پک رہا ہے ——— اماں میں بچا کھاؤنگا"۔

گمان ہو ول سے اس کے دل میں ایک آگ سی لگ جاتی اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگتی۔

خواب و خیال

خواب کی دنیا عجب دنیا ہے ——— ماہرین نفسیات آج تک یہ تعاصل نہ کر سکے ——— کہا تو بس یہی کہا کر خواب کیا ہیں گزرے ہوئے واقعات کا عکس و آئینہ ——— لیکن نہیں نہیں بعض خواب تو مستقبل کی خبر دیتے ہیں ——— اور ان کی تعبیر مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں مشاہدے میں آتی ہیں۔

دل گواہی دیتا ہے کہ خوابوں کی دنیا میں ایک پُر اسرار اور عظیم قوت پنہاں ہے جو ان دیکھے دکھانے اور ان سنے سنانے پر قادر ہے۔

وحی کا آغاز رؤیائے صادقہ ہی سے تو ہوا ——— سچے خوابوں کا ظہور فطرت کی بلندی اور روح کی پاکیزگی کی بیّن دلیل ہے ——— یہ بلندی اور پاکیزگی نبی کی ذات قدسی صفات میں اپنے عروج پر ہوتی ہے، اسی لئے وہ نہ غلط سوچ سکتا ہے اور نہ غلط دیکھ سکتا ہے ——— نہ عالم خواب میں، اور نہ عالم بیداری میں ——— نہ صرف یہ کہ وہ خود غلط سوچتا اور دیکھتا نہیں بلکہ دوسروں کے متعلق جو کچھ سوچتا ہے، اور دیکھتا ہے حرف بحرف صحیح ثابت ہوتا ہے ———

حضرت یوسف علیہ السلام نے خوابوں کی جو جو تعبیریں بتائیں قرآن شاہد ہے کہ مستقبل نے ان تعبیرات پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

ہم میں سے بہت سے لوگوں نے ایسے خواب دیکھے ہوں گے جن کی تعبیریں مستقبل میں نظر آئی ہوں گی ——— نہیں معلوم کہ اوروں نے کیا کیا دیکھا ——— میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کی ایک جھلک دکھاتا ہوں جس سے یہ حقیقت واضح ہو گی کہ خواب ماضی کی آواز بازگشت ہی نہیں، مستقبل کی گونج بھی ہے، سنئے سنئے:

ستمبر ۱۹۴۷ء کے خونریز فسادات سے قبل خواب دیکھا کہ جامع مسجد فتحپوری دہلی میں شامیانے تنے ہیں ——— نمازیوں کا ہجوم ہے ——— کبریٰ پر مؤذن کے ساتھ میں بھی بیٹھا ہوں ——— جمعہ کی نماز ہونے والی ہے ——— خطبہ ہو رہا ہے ——— کہ اچانک شامیانے کی رسیاں ٹوٹ گئیں ——— کبریٰ گر پڑا اور سارے نمازی شامیانوں کے نیچے دب گئے ——— والدِ ماجد حضرت مفتی اعظم شاہ محمد مظہر اللہ علیہ الرحمہ سے یہ خواب عرض کیا تو چہرہ زرد ہو گیا ——— فرمایا صدقہ دیدو ——— مگر جو کچھ ہونا تھا وہ ہو کر رہا، سرزمینِ ہند، بالخصوص دہلی میں مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ڈھائے گئے وہ ایک خونچکاں داستانِ غم ہے ——— نہ کہی جا سکتی ہے اور نہ سنی جا سکتی ہے۔

اور سنئے :-

۱۹۶۰ء کی پاک بھارت جنگ سے قبل خواب دیکھا کہ اسی مسجد جامع فتحپوری کے صحن میں کھڑا ہوں ——— اچانک آسمان پر آفتاب و ماہتاب بڑی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف لپکے اور پھر ٹکرا کر پاش پاش ہو گئے ——— ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا ——— یوں محسوس ہوا کہ جیسے قیامت آگئی ہو ——— ہر شخص لرزاں و ترساں اور گریاں ——— تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ آفتاب کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے دفعتہً آسمان پر نمودار ہوئے اور ایک مرکز پر جمع ہو کر پھر آفتاب بن گئے ——— یہ آفتاب تیزی کے ساتھ آسمان کی بلندیوں پر پہنچا اور ٹھہر گیا ——— سارا عالم نورٌ علیٰ نور ہو گیا ——— اب اس کو ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے افسوسناک آغاز اور حیرت انگیز انجام کی طرف

اشارہ سمجھئے یا ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ہونے والے دو ٹکڑوں کے ملنے کا انتظار کیجئے۔

ہاں اور سنئے :-

بیس پچیس سال ہوتے ہیں، طالب علمی کے زمانے میں خواب دیکھا کہ ایک شاہراہ ہے جو اوپر کی طرف جا رہی ہے جہاں ایک بڑا گنبد ہے اور گنبد پر ایک کلس ——— میں اس شاہراہ پر جا رہا ہوں، حتیٰ کہ گنبد تک پہنچ گیا اور پھر گنبد پر چڑھ کر کلس کو ہاتھ لگایا ——— بظاہر علمی اور دنیوی ترقی کے اسباب مسدود نظر آ رہے تھے ——— لیکن اللہ تعالیٰ جس کو نوازنا چاہتا ہے بغیر اسبابِ ظاہر کے نوازتا ہے ——— وقت گزرتا گیا ——— میٹرک سے ایم اے تک پہنچا اور سندھ یونیورسٹی کے تمام امتحانات میں اول آیا ——— گولڈ میڈل اور سلور میڈل ملا ——— پھر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی جو علوم جدیدہ میں آخری ڈگری تصور کی جاتی ہے ——— سرکاری ملازمت میں ترقیوں پر ترقیاں ملیں ——— یہ سب کچھ ماضی میں خواب دیکھنے کے بعد ظاہر ہوا ——— اس کو تعبیر ہی سمجھنا چاہئے ——— مگر یہ دنیوی ترقیاں عارضی و فانی ہیں ——— مولا تعالیٰ دینی ترقیوں سے نوازے ——— اور آخرت میں شرمندہ نہ کرے، آمین!

ان خوابوں سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ خواب صرف ماضی کا عکس یا ماضی کی آواز بازگشت نہیں بلکہ مستقبل کے بارے میں بہت کچھ بتا دیتے ہیں ——— اشاروں میں، کنایوں میں ——— گو ماہرینِ نفسیات اب تک عالمِ خواب کا کھوج لگا رہے ہیں ——— مگر کچھ پتا نہیں چلتا ؎

ہے دانشِ برہانی حیرت کی فراوانی

پریشاں خیالی

اس دنیوی زندگی کو خواب سمجھ لیں اور آنے والی زندگی کو بیداری ——— یا اِس زندگی کو بیداری سمجھ لیں اور آنے والی زندگی کو ایک خواب ——— کچھ بھی سمجھ لیں، دونوں صورتوں میں بات سمجھ میں آسکتی ہے ——— زندگی پریشان ہو تو

خواب بھی پریشان نظر آتے ہیں ——— کبھی کبھی تو ایسے پریشان خواب نظر آتے ہیں کہ دم گھٹنے لگتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ زندگی سے چھٹکارا ملے تو جان میں جان آئے ——— ایسے پریشان خواب دیکھ کر جب آنکھ کھلتی ہے تو دم میں دم آتا ہے۔

جس طرح اس عارضی زندگی کے اثرات ہماری خوابیدہ زندگی پر مرتب ہوتے ہیں اسی طرح پوری زندگی کے اثرات ہماری برزخی زندگی پر مرتب ہوں گے ——— جو آنیوالی ہے ——— جو یہاں مطمئن ہے وہ وہاں بھی مطمئن ہوگا کہ مطمئن ہونے والا، عالم خواب میں بھی مطمئن ہی رہتا ہے ——— اسی لئے اسلام نے پریشان دماغوں کو سکون و چین کی طرف بلایا کہ کہیں انسان کی پریشان دماغی اس کی عقبیٰ کو برباد نہ کر دے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد بھی یہی بیان فرمایا کہ آپ دلوں کو چین دینے آئے ہیں ——— خدا کی یاد دلانے آئے ہیں ——— بار بار ہدایت کی گئی اور ببانگ دہل اعلان کیا گیا کہ دلوں کا چین تو خدا ہی کی یاد میں ہے ——— بیشک خدا کی یاد میں بڑا چین ہے، بڑا سکون ہے۔ بڑی راحت ہے، بڑی فرحت ہے ——— یاد کر کے تو دیکھو، دل لگا کے تو دیکھو ——— ہاں ہاں چین کو تلاش کرو کہ آنے والی زندگی چین سے گزرے ——— جس کو چین کی تلاش نہیں اور وہ اس پریشانی پر قانع ہے تو اسکو پریشان خوابی کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ عنقریب ایک نہ ختم ہونے والا خواب نظر آنے والا ہے جس کی تعبیر نہ معلوم کب ظاہر ہوگی ——— اسے خواب کہہ لو یا حقیقت پسند ہو تو بیداری کہہ لو ——— یا پھر زیادہ حقیقت پسند ہو تو زندگی کہہ لو ——— جو کچھ ہونے والا ہے وہ سب کچھ سوتے جاگتے دکھایا جا رہا ہے ——— بس نظر چاہیئے سب کچھ نظر آسکتا ہے ——— حشر و نشر کی بات سمجھ میں نہ آتی تھی ——— فرمایا ——— باغوں اور کھیتوں کو نہیں دیکھتے خزاں کے بعد کیسی بہار آتی ہے ——— ہر مردہ چیز زندہ ہو جاتی ہے ——— حشر و نشر کا یہ عمل بار بار ہوتا ہے مگر ہماری آنکھیں نہیں

کھلتیں ——— اور یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ عذاب و ثواب کیسے ہوگا اور کیسا ہوگا ——— لیکن خوابوں کی دنیا میں دکھا دیا کہ غلط کاریاں اور سیہ کاریاں شب کی تاریکیوں میں عذاب بن کر نمودار ہوتی ہیں اور پریشان خوابی سے انسان کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے ——— نیک اعمال اور بداعمال دونوں اپنے اپنے اثرات رکھتے ہیں ——— ان کے اثرات کو مولیٰ تعالیٰ ہی زائل کر سکتا ہے ——— وہی مقلب القلوب ہے ——— وہی مبدل الاحوال ہے، ورنہ ہر عمل اپنا اپنا اثر دکھا کر رہے گا ——— آگ کا کام جلانا ہے، یہ جلائے گی مگر جسے مولیٰ نہ چاہے ؎

نارِ نمرود کو کیا گلزار
دوست کو یوں بچا لیا تو نے

پانی کا کام غرق کرنا ہے، یہ غرق کرے گا مگر جس کو خدا نہ چاہے ؎

پانی میں اس نے راہبری کی کلیم کی

یہ بات کہاں سے کہاں نکل گئی ——— عرض صرف یہی کرنا تھا کہ حشر و نشر میں کچھ شک ہو تو عالمِ خواب کی سیر کرو ——— بات سمجھ میں آجائے گی ——— غور کرو، پھر غور کرو ——— وحیِ الٰہی دل میں گھر کر جائے گی۔

آغوشِ مادر ؎

آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

جس طرح گوہرِ آبدار کے لئے آغوشِ صدف سرمایۂ حیات ہے اسی طرح طفلِ شیر خوار کے لئے آغوشِ مادر سرمایۂ حیات ہے ——— لیکن دورِ جدید کی مشینی زندگی نے بچوں کو آغوشِ مادر سے محروم کر دیا اور عورتوں کو بچوں کی چاہت سے بیگانہ کر دیا ؎

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کیلئے اس کا ثمر موت

معاشرے کی حقیقی ترقی اور خوشحالی اسی آغوش پر منحصر ہے ——— ترقی یافتہ معاشرے میں (جہاں روح سولی پر چڑھی ہے اور جسم صوفے پر بیٹھا ہے) بچے آغوشِ مادر سے دور ہیں اور بعض جگہ بہت دور ——— حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے ایک عظیم معاشرہ پیش کیا جہاں سکون و چین نصیب تھا ——— اُس معاشرے میں عورتوں کو تو بچوں کی چاہت تھی ہی مگر مرد بھی بچوں پر بڑے شفیق و مہربان تھے ——— حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ ہمارے سامنے ہے ——— خطبہ پڑھ رہے ہیں، سامنے سے نواسے کو آتے دیکھا لپک کر اٹھا لیا ——— نماز پڑھ رہے ہیں، پیٹھ پر نواسے بیٹھ گئے تو سجدے ہی سے نہ اٹھے ——— راہ چلتے بچوں کو گود میں لے لے کر پیار فرماتے ——— شاید آج کل کی طرح اُس زمانے میں بھی یہ عمل معیوب تھا اسی لئے جب سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ گلی کوچوں میں بچوں کو پیار کرتے ہیں! ——— فرمایا ——— جب خدا نے تمہارے دلوں سے محبت و شفقت چھین لی تو پھر کیا جواب دوں! ——— اللہ اللہ کیا بات فرمائی! ——— واقعی یہ سوال ہی بتا رہا ہے کہ سائل محبت و شفقت سے بیگانہ ہے ——— بیگانہ نہ ہوتا تو یہ سوال کاہے کو کرتا!

آج باوجود دعوئ اتباعِ سنت کے بہت کم علماء اور صوفیا ایسے ہوں گے جو گلی کوچوں میں بچوں کو اس طرح پیار کریں جس طرح تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے ——— بلکہ بعض حضرات تو بچوں سے بچتے نظر آتے ہیں خصوصاً مجالس و محافل میں ——— اور مساجد میں تو بعض بوڑھوں کو بچوں کا جانی دشمن پایا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون! ——— ہم غیر شعوری طور پر رہبانیت کی طرف جا رہے ہیں ——— ہمارے بعض علماء و صوفیہ میں بھی رہبانیت کسی حد تک دخیل معلوم ہوتی ہے ——— اور شاید عوام بھی ان کو راہب ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔

مغربی ممالک میں "ممتا" کا تصور تقریباً ختم ہو چکا ہے ——— وہاں بچوں کو

نہ ساتھ رکھا جاتا ہے اور نہ ساتھ سلایا جاتا ہے ——— دن کو علیٰحدہ ——— رات کو علیٰحدہ

——— لاحول ولا قوۃ ——— جہاں نفس کی حکمرانی ہو وہاں یہی کچھ نظر آئے گا ؎

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

جس بچے کو آغوشِ مادر ملا ہو ——— جس کو ماں کی شفقت ملی ہو وہ بچہ وحشی نہیں ہو سکتا ——— یہی وجہ ہے کہ مشرقی ممالک باوجود پسماندہ ہونے کے شفقت کے معاملے میں بہت آگے ہیں ——— ان کے بچے وحشی نہیں ——— ہاں مغربی ممالک میں قدم قدم پر آثارِ وحشت نظر آئیں گے اور ایسے ایسے واقعات سننے میں آئیں گے جو نہ کان نے سنے اور نہ آنکھ نے دیکھے ——— یہ حقائق اُن لوگوں کے لئے عبرت ہیں جو مغربی تہذیب و تمدن پر جان چھڑکتے ہیں اور پیروی سنت سے بھی جی چراتے ہیں۔

آئینہ خدا آئینے کا بھلا کرے کہ اس نے ہمیں ہم کو دکھا دیا ورنہ تو ہمیں معلوم ہی نہ تھا کہ ہم کیسے ہیں ——— علم الیقین تھا عین الیقین نہ تھا ——— اس آئینے نے یقین کی دوسری منزل تک پہنچایا ——— اپنے لئے بھی دوسروں کے محتاج تھے اور ایمان بالغیب پر قانع تھے ——— اللہ اللہ عین حضوری میں یہ غیوبت! ——— ہزاروں انسان اپنی صورتوں کو ترستے دنیا سے چلے گئے ——— ساری زندگی دنیا میں رہے مگر خود کو نہ دیکھ سکے ؎

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ایمان بالغیب پر ہی ان کا کام تمام ہوا ——— شاید اسی دورِ ناخود شناسی کی یہ باتیں یادگار رہ گئی ہیں ——— سنیئے! ——— یہ باتیں اور یہ واقعات لطائف نہیں عبرت ہیں۔

ایک کسان کی شکل و صورت اپنے مرحوم باپ سے ملتی جلتی تھی ——— مگر اس کو

پتا نہ تھا کہ آئینہ نہ دیکھا تھا ——— راہ چلتے ایک آئینہ کا ٹکڑا مل گیا، اٹھا کر جو دیکھا، دل باغ باغ ہو گیا، سمجھے کہ والدِ مرحوم تشریف فرما ہیں ——— سلام نیاز پیش کیا اور ادب و احترام سے اٹھا کر وہ ٹکڑا گھر لے آئے ——— ایک مخصوص کوٹھڑی کے طاق میں سجایا اور مقفل کر دیا ——— روزانہ کھیت جانے سے پہلے اس کوٹھڑی میں حاضر ہوتے ——— والدِ مرحوم کو سلامِ محبت پیش کرتے ——— وہاں سے بھی جواب ملتا ——— کہ اپنی صورت آئینہ میں سلام کرتی معلوم ہوتی ہے ——— اور الٹے پاؤں واپس لوٹ جاتے ——— اس یومیہ معمول کو دیکھ کر بیوی کا ماتھا ٹھنکا ——— ایک روز آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ تالا توڑ اندر داخل ہوئیں ——— کیا دیکھتی ہیں کہ سامنے ایک چڑیل بیٹھی ہے ——— اتفاق سے یہ بدصورت اور سیاہ فام تھیں مگر اپنی صورت کبھی نہ دیکھی تھی ——— سمجھیں کہ خاوند اس چڑیل پر دل باختہ ہے ——— بہت برافروختہ ہوئیں اور جب خاوند گھر میں داخل ہوا تو خوب خبر لی ——— مگر وہ معصوم ہکا بکا رہ گیا ؎

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے!

اللہ اللہ یہ لوگ کیسے معصوم تھے کہ ان کو اپنی بھی خبر نہ تھی ——— غالباً اسی لئے خوشامدی نہ تھے کہ خوشامد کی ابتدا آئینہ سے ہوتی ہے ——— انسان خود کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے، بنتا سنورتا ہے پھر دیکھتا ہے ——— چین نہیں آتا پھر دیکھتا ہے ——— اور بعض لوگ تو چلتے پھرتے خود بینی میں مصروف نظر آتے ہیں ——— لیکن بیخبری بھی ایک نعمت تھی کہ انسان خود بینی سے بے نیاز تھا ——— وہ خود بینی جو انسان کو خدا سے بے نیاز کر دیا کرتی ہے ——— جب انسان دل کی گہرائیوں میں اترنے کے بجائے اپنی صورت میں اٹک کر رہ جائے تو یہی کچھ ہوگا ——— اے جوانو! آئینۂ دل صاف کرو ——— خود کو نہ دیکھو اپنے خدا کو دیکھو ——— ہاں اگر خدا کو دیکھنے کے لئے خود کو دیکھنا ہو تو خوب دیکھو کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ ؎

اپنے مَن میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

ایسا دیکھنا، دیکھنے والوں کو مبارک ہو! ؎

تا دوست در رسیدیم چو از خویش گزشتیم
از خویش گزشتن چہ مبارک سفرے بود!

قومی لباس و قومی تہذیب

قومی لباس کا مسئلہ بڑا نازک اور اہم ہے ——— اس کا تعلق قومی تہذیب اور قومی احساسات و جذبات سے ہے ——— اس لئے قومی لباس سے ہر قوم کا جذباتی تعلق ہوتا ہے ——— زندہ قومیں اپنا ہی لباس پہنا کرتی ہیں اور مردہ قومیں دوسروں کا اُترن پہنتی ہیں ——— ہماری تلون مزاجی کا یہ عالم ہے ——— ایک سرے سے دوسرے تک چلے جایئے، رنگ برنگ لباس نظر آئیں گے ——— ایک ہی محفل میں یہ رنگارنگی دیکھی جا سکتی ہے ——— اور ٹوپیاں ——— بیچاری ٹوپیاں ——— اول تو نظر آئیں گی نہیں اور اگر کسی مسجد میں نظر آگئیں تو دو ٹوپیاں یکساں نہ ہوں گی ——— ماسوائے ان ٹوپیوں کے جو کبھی کبھی برہنہ سروں کے لئے مسجدوں میں رکھ دی جاتی ہیں ——— یہ رنگارنگی ہماری تلون مزاجی کی علامت ہے اور یہ علامت کوئی اچھی نہیں ——— یک رنگی اور یک سوئی کی ضرورت ہے ——— ایسے لباس کی ضرورت ہے جو قومی ہونے کے ساتھ شائستہ بھی ہو اور سستا بھی ——— ہر کس و ناکس پہن سکے ——— جن قومی لباسوں میں یہ بات نہیں وہ عوام میں مقبول و پسندیدہ نہیں ہو سکتے۔

قومی لباس قومی عزت کی نشانی ہے، اسی لئے فاتحین مفتوحین کے لباس اور تہذیب و ثقافت کو خود اس کی نظروں میں ذلیل و خوار کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ قومی وحدت پارہ پارہ ہو جائے اور وہ آسانی کے ساتھ مفتومین کے قلب و نظر پر حکومت

کر سکیں۔

دور کیوں جائیے انگریزی کو دیکھئے ——— اُس نے ہندوستان پر قبضہ کر کے رفتہ رفتہ کیا کیا ؟ ——— شریفوں، وزیروں، راجاؤں، نوابوں اور بادشاہوں کے لباس ہر اس ملازم کے لیے تجویز کیے جو بادشاہ سے لے کر معمولی افسر کا کفش بردار و خدمت گزار تھا ——— اور اس طرح ہماری قومی تہذیب کو خود ہمارے سامنے ذلیل و رسوا کر کے ہمارے دلوں سے اس کی محبت نکال دی اور اب اس لباس سے دل لگنے لگا جو فاتح قوم پہنا کرتی ہے ——— اس لباس میں فخر محسوس کیا جاتا ہے ——— افسوس صد افسوس آزادی ملے ہوئے ۲۰ سال ہو گئے لیکن اب تک ہم نے اپنے لباس سے محبت کرنی نہ جانی ——— حالانکہ آزادی ملنے کے بعد انگریز کے طرزِ عمل کا یہ جواب دینا چاہیے تھا کہ صدر سے لے کر معمولی افسر کے ملازمین کو کوٹ پتلون پہنایا جاتا، ٹائی لگائی جاتی، ہیٹ پہنایا جاتا ——— اور خود بھی سیدھا سادا لباس پہنتے جس میں قومی وحدت اور قومی وقار نظر آتا ——— پھر تماشا دیکھتے کہ ایسے ماحول میں صاحب بہادر کس قدر شرمندہ و شرمسار ہوتے۔

لیکن حیف ہمارے اکثر افسروں کو قومی لباس سے للّٰہی بغض رہا ——— جو شاید کسی قوم میں نظر نہ آئے ——— ابتدا میں جناح کیپ، شلوار یا پاجامہ، کرتا یا قمیص اور اس پر شیروانی قومی لباس کی نشانیاں تھیں جو اب قریب قریب مٹ چکی ہیں ——— ہاں تو اس زمانے میں سیکریٹریٹ جانا ہوا اور یہ دیکھ کر حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ چپڑاسی اور اسی قسم کے دوسرے ملازمین قومی لباس میں ملبوس ہیں ——— مگر صاحب بہادر وہی کوٹ پتلون پہنے ہیں جو دورِ غلامی کی بدترین یادگار ہے۔

یہ تو قومی لباس کی بات تھی ——— بات سے بات نکلتی جاتی ہے ایک اور بات سنئے ——— مشرقی طریقہ یہ تھا کہ گھروں میں چاندنیاں بچھائی جاتیں ——— قالین

سجائے جاتے، گاؤ تکیے لگائے جاتے ——— لیکن انگریز حاکم نے مشرق کی ان تہذیبی نشانیوں کو اس طرح مٹایا کہ ان پر صوفے رکھا اور پھر جوتیوں سے اس تہذیب کو روندا ——— انا للہ وانا الیہ راجعون! ——— قومی غیرت کی بات الگ رہی ——— ذرا عقل سے تو سوچیے اس میں کیا معقولیت ہے کہ ہزاروں روپے کے فرش و فروش بچھائے جائیں اور اس پر خود نہ بیٹھیں بلکہ اس کو جوتیوں سے پامال کریں ——— ذرا انصاف سے کہیے مغربی تہذیب میں معقولیت ہے یا مشرقی تہذیب میں؟ ——— اقبال نے دل لگتی بات کہی ہے کہ غلامی میں قوموں کا اندازِ فکر بدل جاتا ہے ——— واقعی بدل جاتا ہے، اگر نہ بدلتا تو ہم اپنی تہذیب کو کیوں ٹھکراتے!

نہ معلوم کتنی صدیوں کے بعد انسان نے سلیقے سے بیٹھنا سیکھا لیکن برا ہو اس تہذیب کا جس نے بیٹھے بیٹھے اٹھا دیا ——— اللہ اللہ خاک میں ملنے والا انسان کس طرح اس خاک سے بچتا پھرتا ہے حتیٰ کہ زمین پر بیٹھنا اس کو دوبھر معلوم ہوتا ہے ——— ہاں یہی انسان جو صوفوں پر بیٹھتا ہے جو مسہریوں پر سوتا ہے، جو موٹروں میں پھرتا ہے ——— زمین پر قدم نہیں رکھتا کہ زمین اس قابل نہیں ——— لیکن نہیں نہیں یہی زمین اس کو ایسی سخت گرفت میں لے گی کہ وہ بھنّا بکارہ جائے گا۔

دیکھو دیکھو وہ کالی کملی والا ہمارا (صلی اللہ علیہ وسلم)، نہ مسہریوں پر سوتا ہے اور نہ کرسیوں اور صوفوں پر بیٹھتا ہے، وہ زمین پر سوتا ہے ——— وہ زمین پر بیٹھتا ہے ——— آؤ آؤ تم بھی زمین پر بیٹھو ——— ہاں اے صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھ کر ذلیلوں کو پامال کرنے والو! آؤ زمین پر بیٹھ کر سر و پدل کو پامال کرو اپنی رفعتِ شان کا دنیا کو تماشا دکھا دو!

افکار و احجار

ایک پتھر وہ ہیں جو مارے مارے پھرتے ہیں اور ایک وہ ہیں جو محفوظ خزانوں میں رکھے جاتے ہیں ——— جن پر پہرے بٹھائے جاتے ہیں ——— سب ہی پتھر ہیں مگر پتھر پتھر میں فرق ہے ——— سب ہی سوچتے ہیں مگر سوچ سوچ میں

فرق ہے ——— زمین و آسمان کا فرق ——— ایک فکر وہ ہے جسے کوئی کوڑی کے مول لینے کو تیار نہیں اور ایک وہ ہے جس کے لئے گھر لٹائے جاتے ہیں، جانیں نذر کی جاتی ہیں۔

یہ کیا راز ہے؟ ——— کچھ تو بتاؤ! ——— یہ کیا بات ہے؟ ——— کچھ تو سناؤ! ——— فیضانِ نظر کی بات ہے ——— جو پتھر فیضِ سماوی سے فیض یاب ہوا اہل دل الماس بن کر چمکا ——— اور جو فکر فیضانِ نبوت سے فیض یاب ہوا، آفتاب عالمتاب بن کر جگمگایا ——— جب آفتاب نبوت طلوع ہوا، مشرکینِ عرب کی عقلوں پر پتھر پڑے ہوئے تھے ——— پھر اس نے ان تیرہ و تار عقلوں کو نورِ مطلق کی شعاعوں سے چمکا کر "کوہِ نور" بنا دیا ——— اب وہ پتھر نہ تھے ——— نہ معلوم کیسے کیا ہو گئے تھے ——— دیکھنے والے حیران تھے ——— پتھر ہیرے بن رہے تھے ——— کنکریاں لعل بدخشاں بن رہی تھیں ——— دنیا کی قسمت جاگ رہی تھی۔

فکر و صاحبِ فکر

خدا نے انسان بنایا اور فکر و خیال کو آزاد کر دیا ——— لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ——— کوئی ہے جو اپنی ملک کو اتنا اختیار دے دے؟ اور بے اختیار کو مختار بنا دے؟ ——— یہ اسی بے نیاز کا کام ہے ——— لیکن ہاں وہ اختیار کے ناجائز استعمال پر ضرور باز پرس کرتا ہے ——— اس لئے نہیں کہ وہ نیاز مند ہے، اس لئے کہ وہ رحیم و کریم ہے ——— یہ باز پرس معقول بھی ہے اور مشفقانہ بھی۔

اسلام کو افکار سے غرض ہے، اشخاص سے نہیں کہ اصلاحِ فکر ہی سے شخصیت بنا کرتی ہے ——— اشخاص سے غرض ہوتی تو کفار و مشرکین مسلمان ہونے کے بعد بھی قابلِ نفرت رہتے اور فاجر و فاسق توبہ کر لینے کے بعد بھی لائقِ ملامت رہتے ——— لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ کفار و مشرکین محبوب بن رہے ہیں اور فاسق و فاجر مرغوب ہو رہے ہیں ——— کیوں؟ ——— کہ افکار میں انقلاب آچکا ہے ——— جام وہی ہے شراب

اور ہے ——— مجوسیت کا ایک راز سربستہ افشار ہو رہا ہے ——— خدا کو انسان سے نفرت نہیں، اس کی کج فہمی اور کجروی سے نفرت ہے ——— جب سیدھا راستہ دکھایا گیا تو ٹیڑھے راستے پر کیوں چلا گیا؟ ——— سزا اس کجروی کی ہے۔

رحمتِ عالم نے فرمایا "انسان، انسان کا بھائی ہے" ——— اور یہ بھی فرمایا "مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے" ——— ایک 'انسانی اخوت' ہے اور ایک 'اسلامی اخوت' ——— ہمیں ان دونوں اخوتوں کی حقیقت پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہوگا ——— عین جنگ میں کفار و مشرکین کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں اس بات کی غماز ہیں کہ جنگ اشخاص سے نہیں، افکار سے ہے ——— دیکھو دیکھو میدانِ جنگ کی طرف ایک فوج جا رہی ہے اور تاجدارِ دو عالم ہدایت دے رہے ہیں ——— "میدانِ جنگ میں جو مدِ مقابل ہے اس کا سر پھوڑ دو کہ اس میں شیطان نے گھونسلہ بنا رکھا ہے" ——— "ہاں خبردار! کسی شہری، بوڑھے، بچے، عورت پر ہاتھ نہ اٹھانا" ——— "عمارات کو مسمار نہ کرنا، کھیتوں کو پامال نہ کرنا"

سوال کرنے والا سوال کر سکتا ہے کہ جب جنگ افکار سے تھی تو اشخاص کا کیوں خون بہایا گیا؟ ——— ہاتھ، پیر، ناک، کان دشمن بھی کاٹتے ہیں اور سرجن بھی کاٹتا ہے ——— مگر کاٹنے کاٹنے میں بڑا فرق ہے ——— جس طرح جسمانی حیات کی بقا کے لیے اعضائے انسانی کاٹے جاتے ہیں، اسی طرح ملی حیات کے لئے بھی کاٹ چھانٹ ضروری ہے ——— اسلام میں 'حیاتِ ملی'، 'فکرِ صحیح' سے عبارت ہے ——— اسلام ایک ماہر سرجن کی طرح ایسے اعضائے ملی کاٹ پھینکتا ہے جو ملت کی حیاتِ اجتماعیہ کو مجروح کر دیں ——— اسی کا نام 'جہاد' ہے ——— جو جسموں کیلئے نہیں، دماغوں کیلئے کیا جاتا ہے۔ ——— عملِ جہاد حکیمانہ ہے ——— عملِ جنگ سفاکانہ ہے ——— جہاد کا مقصود اصلاحِ فکر ہے ——— جنگ کا مقصود اقتدارِ نفس اور

ہلاکتِ جسم و جاں ——

جرم و سزا اور خدمت و جزا

جرم و سزا اور خدمت و جزا میں عدل ضروری ہے —— سزا کے معاملے میں 'عدل' سے آگے 'عفو' ہے —— اور جزا کے معاملے میں 'عدل' سے آگے 'فضل' ہے —— لیکن حیف! جدید معاشرے میں 'عدل' ہی نہیں —— 'عفو' اور 'فضل' کی بات تو بہت اونچی ہے —— 'عدل' کی جگہ 'ظلم' کی کارفرمائی ہے —— جرم تھوڑا، سزا بہت —— جرم بڑا، سزا کچھ نہیں —— خدمت تھوڑی، جزا بہت —— خدمت کچھ نہیں، صلہ لامحدود —— عجیب عجیب تماشے نظر آتے ہیں —— قصور کسی کا، معاف کوئی کرے —— قتل کسی کا، درگزر کوئی کرے —— یہ بات تو خدا بھی نہیں کرتا —— اس عادلِ مطلق کی شان یہ ہے کہ سوائے اپنے قصور کے کسی کا قصور خود معاف نہیں کرتا جب تک کہ وہ خود معاف نہ کرے جس کا قصور ہوا ہے —— اور کسی کو کوئی قتل کرتا ہے تو جب تک مقتول کے ورثا معاف نہ کریں، قاتل معاف نہیں کیا جاتا —— یہ ہے عدل! —— یہ ہے انصاف!

عالمِ حقیقی نے جرم کی نوعیت کا خود فیصلہ فرمایا ہے کہ انسان ظالم و جاہل ہے —— ہاں بعض جرائم میں خلیفۂ وقت کو مختار بنایا ہے —— لیکن اُس کا اختیار محدود ہے، اُس کی ذمہ داریاں بہت ہیں —— ہمارا حال یہ ہے کہ ہم خود جرائم کا تعین کرتے ہیں جس طرح ان کی سزاؤں کا تعین کرتے ہیں —— کوئی ہماری بات نہ مانے کشتنی، سوختنی، گردن زنی ہے —— خدا کی بات نہ ماننے، کوئی حرج نہیں —— لیکن ہماری بات ضرور ماننی چاہیئے —— جب فرمودۂ انسان، فرمودۂ خدا ہو جائے —— اور فرمودۂ خدا، فرمودۂ انسان بن جائے تو پھر معاشرے کا اللہ ہی مالک ہے!

—— جب تک جرم کو قانونِ الٰہی کی روشنی میں نہ دیکھیں گے —— اور جب تک سزا میں دامنِ عدل نہ تھامیں گے بلکہ کچھ آگے بڑھ کر اپنے قصور واروں سے درگزر نہ کریں گے

——— اور جب تک خدمت کا پورا پورا صدقہ نہ دیں گے بلکہ کچھ آگے بڑھ کر دامن نہ بھر دیں گے ——— نہ خدا راضی ہو سکتا ہے اور نہ خدا کے بندے ——— ہاں نفس راضی ہو سکتا لیکن نفس کی رضا ہلاکت کا پیش خیمہ ہے ——— ہاں اے اہلِ دانش و بینش! جذبات کو شریعت کے تابع کر دو اس کے آگے جھک جاؤ جس نے حکومت و سلطنت کے وہ گُر بتائے جو رہتی دنیا تک کوئی نہ بتا سکے گا ؎

بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

بس و بے بس

اللہ اللہ! ہم بس میں نفس کے ہاتھوں بے بس ہوئے جاتے ہیں ——— بھری بس میں ایک ایک سیٹ کو تکتے پھرتے ہیں ——— خالی ہوتے ہی ایسے لپکتے جھپٹتے ہیں جیسے چیل چھیچھڑوں پر لپکتی ہے یا باز چڑیوں پر جھپٹتا ہے ——— اللہ اکبر! ایثار و قربانی کا ایک وہ عالم تھا کہ مجاہدینِ اسلام لہولہان، زخموں سے چور، جاں بلب میدانِ جنگ میں پڑے ہیں، شدت کی پیاس لگی ہے ——— پانی پلایا جاتا ہے تو کوئی نہیں پیتا ——— اخوتِ اسلامی کا عجب نظارہ نظر آتا ہے ——— جس مجاہد کے منہ کے آگے کٹورا لگایا جاتا ہے وہ دوسرے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس کو پلاؤ ——— پلانے والا آگے بڑھتا جاتا ہے اور یہی اشارے پاتا جاتا ہے ——— حتٰی کہ وہ آخری جاں بلب مجاہد تک پہنچا لیکن وہ بھی نہیں پیتا اور اپنے رفیق کی طرف اشارہ کرتا ہے ——— ادھر ملک الموت جامِ شہادت لیے کھڑا ہے ادھر پانی کا کٹورا جانثاروں کی محفل میں گردش کر رہا ہے ——— کوئی نہیں پیتا کہ رفیق تو پیاسا ہے، میں کیسے پی لوں؟ ——— اور ہر ایک جاں بلب ایک ایک کر کے جامِ شہادت نوش کر لیتا ہے ——— ان شہیدوں نے وہ مینارۂ محبت روشن کیا جو رہتی دنیا تک روشنی دکھاتا رہے گا۔

ایثار و قربانی کا یہی جذبہ تھا جس نے وحدت و یگانگت کا وہ کرشمہ دکھایا

کہ دنیا نے کبھی نہ دیکھا ہوگا ——— اسی لئے وہ بڑھتے رہے ——— وہ پھیلتے رہے ——— وہ چھاتے رہے ——— انہوں نے سنگ و خشت پر حکومت نہیں کی، دلوں پر حکومت کی ——— کوئی کر کے تو دکھائے!

لیکن آج ہماری خود غرضیوں نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا ——— ہم نے اپنی میراث گنوا دی ——— ہم نے اپنی دولت لٹا دی ——— ہم نے خود اپنے گھر میں آگ لگا دی ——— حیف تم نے کیا کیا! ؎

آنچہ ما کردیم بر خود ہیچ با بیگانہ نہ کرد

ذرا غور کیجئے جس قوم کے افراد لبوں میں ایک سیٹ کو یوں تکتے پھریں ——— سیٹ مل جائے تو چھپٹ پڑیں ——— نہ ملے تو لڑ پڑیں ——— بھلا ایسی خود غرض قوم کا کیا انجام ہوگا!

اے ہموطنو! اپنے اسلاف کی راہ پر چلو ——— ایثار و قربانی کے چراغ روشن کرو ——— بھائیوں کے لئے جان نذر کر دو کہ ؎

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی

زمین و آسماں شاہانِ عالم نے کرۂ ارض پر بہت سے کھیل کھیلے ہیں ——— مگر اس شہنشاہِ بحر و بر کے قلب کی وسعتوں کو تو دیکھو جس نے کرۂ ارض کو ایک کھیل سمجھا ——— وہ زمین سے بلند ہوا ——— بہت بلند کہ جہاں کسی بڑے سے بڑے انسان اور بڑے سے بڑے فرشتے کا بھی گزر نہیں ؎

ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں

——— غلامانِ مصطفےٰ کے لئے کیسے شرم کی بات ہے کہ وہ آسمان کی نہیں، زمین کی بات کرتے ہیں ——— انسان آسمانی مخلوق ہے جو زمین پر بھیجی گئی ہے ——— قصۂ ابلیس و

آدم نے اس کی سماویت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے ——— وہ مسافر ہے اور ہوشمند مسافر اپنے گھر ہی کو گھر سمجھتا ہے ——— سرائے کو گھر سمجھ کر پیر نہیں پسارتا ——— جہاں جاتا ہے مسافرانہ بسر کرتا ہے ——— انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کے حالات پڑھو اور غور کرو کہ "میانِ کوئے یار" نے دنیا میں کیسے بسر کی ——— حیرت ہوتی ہے ——— اور یہ حیرت بھی ہماری غفلت کی غماز ہے ——— ہم میخانے میں آئے، ساقی پر نظر نہ رکھی جامِ سبو پر نظر رکھی! ——— حیف صد حیف، نگاہِ ساقی میں لطف صد میخانہ نہ پایا!

جمادات، نباتات آسمان سے نہیں آتے، گو فیضِ سماوی سے محروم نہیں ——— حشر و نشر میں ان کا کوئی ذکر نہیں ——— ان کی تباہی و بربادی کی بات ضرور کی گئی ہے حتیٰ کہ اجرامِ فلکی میں ماہتاب کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے اور جمادات میں پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہونے کی اطلاع دی گئی ہے ——— لیکن جو ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ ہو چکا ہے اس کے اٹھ کھڑے ہونے کا ذکر ہے اور جا بجا ذکر ہے ——— کیسی حیرت کی بات ہے! ——— اگر یہ سماوی نہ ہوتا تو زمین اس کو کھا جاتی ——— مگر یہ آسمانی امانت ہے ——— سجودِ ملائک ہے۔

مگر پھر بھی ہم زمین کی بات کرتے ہیں ——— "مادرِ گیتی" کہہ کر پکارتے ہیں ——— ——— بت پرست نہیں مگر بت پرستی کرتے ہیں ——— ہم زمین کے ترانے گاتے ہیں ——— ہم نہ آسمان کی بات کرتے ہیں اور نہ آسمان والے کی ——— ہم اس حقیقت کو نہیں سمجھ پاتے کہ زمین ہمارے لئے ہے ——— ہم زمین کے لئے ہیں ——— حدیثِ قدسی میں بڑے پتے کی بات فرما دی ——— "آپ نہ ہوتے تو یہ نہ زمین و آسمان ہوتے اور نہ یہ مخلوق" ——— ہاں یہ سب کچھ انسانِ کامل کے دم قدم کا طفیل ہے ——— یہ سب کچھ آقا کے لئے ہے ——— ہاں یہ سب کچھ غلاموں کے لئے بھی ہے۔

دیکھو دیکھو! تاجدارِ عجم زمین پر سجدے کر رہا ہے ——— زمین کو سجدے

نہیں کر رہا! ——— زمین کو سمجھے تو پہلے ہوتے تھے ——— اُس نے زمین کی پستیوں کو آسمان کی رفعتوں سے جا ملایا ——— یہ عظیم حقیقت آنکھ سے دیکھ رہے ہیں لیکن عقل سے نہیں سمجھ پاتے ——— عقل کی بصارت گم ہو گئی ——— زمین کی محبت نے ہمیں دیوانہ بنا دیا ——— بھائی کا بھائی دشمن ہو گیا ——— انسان انسان کے خون کا پیاسا ہو گیا ——— ایک وہ تھے جو اللہ کی محبت میں دیوانے تھے اور دوستوں کے لئے ابرِ کرم ——— اور ایک ہم ہیں جو زمین کے لئے دیوانے ہیں اور اپنے دوستوں کے لئے قہر در قہر ——— وہ زمین کو صرف اس لئے چاہتے تھے کہ اس پر اللہ کا نام لیا جاتا تھا ——— ہم کو اس سے غرض نہیں، ہم زمین کو زمین کے لئے چاہتے ہیں ——— اور اس کے لئے جان دینے کو تیار ہیں، خدا کے لئے نہیں ——— گویا کہ وہ ہمارا خالق نہیں، مالک نہیں، رازق نہیں، زمین ہی سب کچھ ہے ——— انا للہ وانا الیہ راجعون!

اے یارانِ وطن! کہاں جا رہے ہو؟ کچھ تو سوچو تم کون ہو؟ ——— تم کیا ہو؟ ——— خدا کے بندے ہو ——— محمد مصطفٰے کے غلام ہو ——— تم زمین پر حکومت کے لئے آئے ہو ——— یہ کیا ہوا کہ اس بے جان زمین کے پیچھے دل و دماغ دے بیٹھے! ——— دیکھو دیکھو! وہ معراج کا دولہا جو زمین سے آسمان اور آسمان سے عرش تک اور عرش سے بھی آگے جا پہنچا ——— اپنے جانثاروں کو کیا حکم دے رہا ہے ——— کہ فتح ہو چکا ہے ——— جانثاروں سے کہہ رہا ہے کہ تمہارے گھروں میں جو لوگ بس گئے، اپنے گھر انہیں کو دے دو ——— اور خود بھی اپنے وطن سے واپس جا رہا ہے ——— ہاں وہ زمین سے بے نیاز ہے ——— زمین اس کی نیازمند ہے ——— وہ کہہ رہا ہے جس کے پاس زمین کا ٹکڑا ہے وہ اپنے بھائی کو نذر کر دے ——— اگر وہ زمین کا پرستار ہوتا تو یوں بے نیازانہ زندگی بسر نہ کرتا جیسے زمین و زماں سے اس کو کچھ سروکار ہی نہیں ——— لیکن ہم اس زمین کو جس کو محمد مصطفٰے نے ٹھکرایا

—— گھور گھور کر للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں —— بڑھ بڑھ کے لے رہے ہیں، ایک ایک انچ پر لڑ رہے ہیں اور ایک دوسرے کا سر پھوڑ رہے ہیں —— محبت کے تاج محل میں آگ لگتی ہے تو لگنے دو لیکن اپنے نفس کی آگ نہ بجھنے دیں گے اور اس الاؤ کو روشن رکھیں گے۔ (استغفراللہ! معاذاللہ!)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اس زمین پر کتنوں نے حکومتیں کیں، کتنوں نے جنگیں لڑیں، کتنوں نے محل بنائے —— لیکن پھر کیا ہوا؟ —— وہ حکومتیں افسانہ بن کر رہ گئیں —— اور وہ محل عبرت کدہ بن کر رہ گئے —— لیکن زمین جہاں کی تہاں موجود ہے —— نہ وہ کھیل ہے اور نہ وہ کھلاڑی —— سب ملکِ عدم کو چلے گئے —— آفریں ہے ان اولوالعزم ہستیوں کو جو اس کھیل میں شریک نہیں ہوئے اور کھیل کو کھیل ہی سمجھا —— وہ زمین سے بلند ہوئے، بہت بلند —— اور زندگی کو پایا، وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ ۚ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ۔

مرد و زن پاکستان بنایا تھا اور اس لئے بنایا تھا کہ مرد و زن اپنی اپنی حدود کی پاسداری کریں گے —— شریعت کا بول بالا ہوگا، اور ابلیس کا منہ کالا —— لیکن نہیں وہ کچھ ہوا جو خواب و خیال میں بھی نہ تھا —— حدود و قیود کو توڑ دیا گیا اور احکامِ الٰہیہ کو اس طرح پامال کیا گیا کہ روحِ ابلیس بھی تڑپ کر رہ گئی —— اُس کا قصور یہ تھا کہ اس نے خدا کے حکم سے غیرِ خدا کو سجدہ نہ کیا لیکن ہمارا گناہ یہ ہے کہ ہم خدا کے حکم سے بھی خدا کے آگے نہ جھکے ہاں عملاً اعلانِ بغاوت کیا —— وہ جو کبھی رونقِ خانہ تھی؛ رونقِ کوچہ و بازار ہوگئی —— اور وہ جو کبھی بہارِ محفل تھا، ویرانوں کی نذر ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

محفلِ شادی ہو یا مجلسِ عزا، ہر جگہ دونوں ساتھ ملیں گے، حد تو یہ ہے کہ حسنِ قرأت

کی محفلوں میں بھی دونوں ساتھ ساتھ نظر آنے لگے ہیں ـــــ گویا اس طرزِ عمل سے خدا کو منہ چڑایا جارہا ہے (معاذ اللہ! معاذ اللہ!) ـــــ یہ بات تحریکِ پاکستان کے وقت کبھی خیال میں نہ آئی تھی کہ بات یہاں تک پہنچے گی ـــــ ورنہ ذرا غور تو کیجئے کیا ملتِ اسلامیہ کے ان گنت علماء و صلحاء نے اس فسق و فجور اور اس سرکشی و نافرمانی کے لئے کوشش کی تھی؟ ـــــ ہرگز نہیں! ہرگز نہیں! ـــــ ان کا دامن اس داغ سے داغدار نہیں۔

اللہ اللہ! کوچہ و بازار صحنِ خانہ بن کر رہ گئے ـــــ اسی طرح گھومتی پھرتی ہیں جیسے کوئی اپنے صحن میں پھر رہا ہو ـــــ صرف پھرنے پر ہی بس نہیں، خود نمائی کے وہ مظاہرے کہ الامان و الحفیظ! ـــــ بعض مردوں کی تنخواہ کا بیشتر حصہ اس خود نمائی پر صرف ہو جاتا ہے ـــــ اور کبھی خود بھی کما کر لگایا جاتا ہے ـــــ اور ہاں پھر شکایت کہ "فلاں ہم کو گھور رہا ہے" ـــــ "فلاں ہم کو چھیڑ رہا ہے" ـــــ گھورنے اور چھیڑنے سے حیرت نہیں ہوتی ـــــ نہ گھورتے اور نہ چھیڑتے تو حیرت ہوتی کہ اس دورِ پُر آشوب میں بھی قرنِ اول جیسے پاکباز مسلمان موجود ہیں کہ ہزار دلفریبیوں اور رعنائیوں کے باوجود ان کے دل اپنے مولیٰ کی طرف متوجہ ہیں ـــــ یاد آیا، دورِ فاروقی میں ہرقلِ روم نے چند صحابیوں کو حسین و جمیل دوشیزاؤں اور ہزار سامانِ تعیش کے ساتھ کچھ عرصہ کے لئے ایک کمرے میں بند کر دیا ـــــ ہفتے گزر گئے لیکن کسی نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا ـــــ یہ ہے کمالِ سیرت! ـــــ صحبتِ نبوی میں اس کمال تک پہنچ چکے تھے جہاں نہ نظر بہکتی ہے اور نہ دل گمراہ ہوتا ہے۔ ـــــ ان کے آقا کی شان ہی یہ تھی:

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى

ایک نکتہ عرض کرتا چلوں ـــــ لوگوں نے شریعت کی سخت و شدید تعزیرات و حدود کو تو دیکھا لیکن یہ نہ دیکھا کہ شریعت نے جرائم کے سدِّ باب کے لئے کیسا اہتمام کیا ہے! ـــــ ایسا اہتمام کسی حکومت یا کسی معاشرے نے کبھی نہ کیا ہوگا ـــــ اس اہتمام کے

بعد اگر جرم سرزد ہوتا ہے تو شدید سے شدید تر سزا بھی ملی ہے ——— لیکن ہم تو جرائم پر اکسا رہے ہیں ——— جذبات بھڑکا رہے ہیں ——— بھوکوں کی نگری میں لنگر خانہ کھلا ہے اور چاہتے یہ ہیں کہ اس لنگر سے کوئی فیضیاب ہو ——— دستر خوان بچھا ہے لیکن کوئی بھوکا آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے ——— نظر اٹھائی تو آنکھ نکال لی جائے گی ——— زبان چلائی تو کھینچ لی جائے گی ——— ہاتھ بڑھایا تو کاٹ دیا جائے گا ——— سبحان اللہ! یہ کیسی سزا ہے! یہ کیسا ظلم ہے جو نوعِ انسان پر کیا جا رہا ہے! ——— عقل تو یہ کہتی ہے کہ جرائم کی تحریک و ترغیب ہو تو سزا کی بات بھی نہ ہونی چاہیئے بلکہ جو جرم نہیں کرتے ان کو انعامات سے سرفراز کرنا چاہیئے۔ ایسی حالت میں ہلکی سے ہلکی سزا بھی شدید سے شدید تر ہے۔

لوگ کہتے ہیں سنگسار کرنا حیوانیت ہے (معاذ اللہ!) ——— لوگ کہتے ہیں دُرّے لگانا درندگی ہے (معاذ اللہ!) ——— لوگ کہتے ہیں ہاتھ کاٹنا سفاکی ہے مگر کہنے سے پہلے کسی نے یہ نہ دیکھا کہ سنگسار کب کیا گیا! ——— دُرّے کب لگائے گئے ——— ہاتھ کب کاٹے گئے! ——— تحریک و ترغیب کی بات تو الگ رہی اسلامی معاشرے میں ارتکابِ جرم کا شائبہ تک نہیں ——— اور پھر بھی جرم کیا گیا ——— عقل کہتی ہے کہ ہاں اب سزا دو اور خوب سزا دو!

بات کہاں سے کہاں نکل گئی، ذکر تھا مرد و زن کی بے حیائی اور آزادی کا ——— کہتے ہیں یہ بے حیائی نہیں زمانہ کی ہوا ہے، جدھر کی ہوا ہو ادھر چلنا چاہیئے ——— پست ہمتوں کا یہ اصول ہوگا لیکن بلند ہمتوں کا یہ اصول نہیں ——— مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ ہوا کا رخ جس طرف چاہے پھیر دیتا ہے ——— وہ زمانے کو اپنے ساتھ چلاتا ہے۔ زمانے کے ساتھ نہیں چلتا ؎

ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

گزشتہ چودہ برس میں اسلام نے جس تہذیب کو جنم دیا کیا وہ نامعقول تھی؟ ——
کیا اس تہذیب کو اپنانے والے دیوانے تھے؟ —— نہیں نہیں، انہوں نے تو دورِ
جدید کو عقل سکھائی ہے —— وہ عقل و دانائی کے پتلے تھے —— وہ دیوانے
ہوتے تو ہم کو دھرا میں ٹکریں مارتے پھرتے —— ہمارا یہ رنگ ڈھنگ نہ ہوتا ——
ہماری یہ اٹھان نہ ہوتی —— کیا تم نے سنا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں عورتیں
اس طرح بے حجاب بیٹھی ہوں؟ —— کیا تم نے سنا کہ عہدِ رسالت مآب یا عہدِ خلافت
میں عورتیں اس طرح سڑکوں پر ماری ماری پھری ہوں؟ —— کیا تم نے سنا کہ گزشتہ چودہ
برس میں مسلم معاشرے میں یہ آفت آئی ہو کہ اس کی عورتیں کوچہ و بازار میں یوں خود نمائی اور
خود آرائی کے مظاہرے کرتی پھری ہوں اور ہر محفل کی رونق بنی ہوں؟ —— نہیں نہیں،
آج تک نہ کسی آنکھ نے یہ منظر دیکھا اور نہ کسی کان نے بے حیائی کی یہ داستان سنی ——
تو پھر بتاؤ تم کدھر جا رہے ہو؟ —— تم نے محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن کیوں چھوڑ دیا؟
—— تم چادرِ فاطمۃ الزہرا کی عظمت کو کیوں داغدار کر رہے ہو؟ بلکہ تار تار کر رہے
ہو؟ —— اٹھو اٹھو! دامنِ مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) تھام لو —— بڑھو بڑھو
چادرِ بتول کی لاج رکھ لو —— شرماؤ نہیں —— کیا تم نے کسی عاشقِ دل فگار
کو دیکھا ہے کہ وہ محبوب کی راہوں پر چلتے شرماتا ہو؟ —— نہیں نہیں، یہ راہیں تو
اس کے لئے سرمایۂ حیات ہیں —— ان راہوں کا ایک ایک ذرہ اس کی آنکھ کا تارا اور
دل کو پیارا ہے —— تو پھر اپنی محبت کو رسوا نہ کرو —— اپنے عشق کو بدنام
نہ کرو —— دیوانہ وار آگے بڑھو —— جو کچھ کہتے ہو کر دکھاؤ کہ قیامت کی
گھڑی ہے، عمل کی پوچھ ہے۔

ہر اُس خیال کو دل سے نکال دو جو محمد مصطفےٰ کا خیال نہ ہو —— ہر اس محفل
سے اٹھ جاؤ جہاں محمد مصطفےٰ کا جمال نہ ہو —— ہر اس ادا کو چھوڑ دو جو محمد مصطفےٰ کی

اداش ہو ـــــــ ہر اس منفعت سے منہ موڑ لو جو نعارہ گاہ محمد مصطفےٰ نہ ہو ـــــــ ہاں محمد مصطفےٰ کے ہو جاؤ کہ زمانہ تمہارا ہو جائے ؎

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

منازل و مراحل نفس اگر برائی میں ملوث ہو چکا ہے تو اتنا تو ہو کہ انسان برائی کو برائی کہے یا پھر خدا توفیق دے تو اس برائی پر ملامت کرے ـــــــ بہت حوصلہ ہو تو قدم آگے بڑھائے اور برائی کو اس طرح روک دے کہ پھر کبھی اس طرف رخ کیا نہ کرے۔

لیکن پہلی منزلیں ہیں ـــــــ ایجابی مرحلے یہ ہیں کہ برائی کو ہاتھ سے روک دے یا پھر زبان سے اس کا سدِ باب کرے ـــــــ یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر دل سے برا جانے ـــــــ اس کے بعد کوئی منزل اور مرحلہ نہیں ـــــــ ضعیف ترین ایمان یہ ہے کہ برائی کو دل سے برا جانے ـــــــ گناہ کا شعور باقی ہے تو مغفرت و بخشش کی امید بھی باقی ہے۔

اے رفیقو! اے ساتھیو! آؤ آؤ قدم آگے بڑھائیں اور منزلیں اور مرحلے طے کرتے جائیں ـــــــ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رواں دواں رہیں ـــــــ اس وقت تک کہ ہم نفسِ مطمئنہ کی معراج تک نہ پہنچ جائیں ـــــــ ہاں اس وقت تک کہ ہم ہر برائی کو اپنے ہاتھ سے روک نہ دیں۔

دل و دماغ دل و دماغ دونوں قابلِ قدر ہیں مگر افسوس ایک نے دل کو چھوڑا اور دوسرے نے دماغ کو چھوڑا ـــــــ ایک کے لیے برخلافِ عادت مردود ـــــــ دوسرے کے لیے برخلافِ عادت مقبول و محمود ـــــــ ایک کی سیرت سراپا یقین ـــــــ دوسرے کی سیرت سراپا فسون و افسانہ ـــــــ دل و دماغ کی جدائی نے زندگی کی اصل

ندرت سے محروم کر کے انسان کو سنسان وادیوں میں چھوڑ دیا ہے بلکہ دہکتی جہنم میں دھکیل دیا ہے ——— وہ جہنم میں پھونک رہا ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے ؎

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

وہ وادیوں میں بھٹک رہا ہے اور بزبانِ بے زبانی کہہ رہا ہے ؎

کھویا کھویا سا پھر رہا ہوں میں
گویا صحرا میں لٹ گیا ہوں میں

اے دل والو! دماغ کی بات کرو اور ہاں اے دماغ والو! دل کی بات کرو

کاروبارِ جہاں سنورتے ہیں
ہوش جب بیخودی سے ملتا ہے

آؤ آؤ! سنسان وادیوں کو نالۂ عنادل سے چہکا دیں ——— آؤ آؤ! نارِ نمرود کو گلزار بنا دیں!

اعجازِ فاروقی

صورتیں نہیں، سیرتیں چمکتی ہیں ——— اور جب سیرتیں چمکتی ہیں تو صورتیں بھی چمکنے لگتی ہیں ——— آفتاب چمکتا ہے تو ماہتاب چمکتا ہے۔ آفتاب نہ چمکے تو ماہتاب کہاں سے آئے! ——— ظاہری سج دھج میں کیا رکھا ہے ——— کچھ بھی تو نہیں ——— ایک حادثۂ عظیم رونما ہونے والا ہے ——— سب نقش و نگار مٹ کر رہ جائیں گے ——— اللہ اللہ ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

لیکن انسان حسنِ ظاہر پر فریفتہ ہے ——— حسنِ باطن پہ نہیں ——— وہ عظمتوں کو ظاہر میں تلاش کرتا ہے حالانکہ وہ تو باطن میں پنہاں ہیں ——— اُس کو نہیں معلوم کہ

حسن ظاہر کی چمک عارضی و فانی ہے ——— دیکھو دیکھو! کتنے چمکنے والے ہماری آنکھوں کے سامنے چمک چمک کر بجھتے جا رہے ہیں ——— اور بال جو چمکے تھے اب تک چمک رہے ہیں۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) ———

باکمال سیرتیں غضب کا اثر رکھتی ہیں ——— کمال نہیں تو اثر نہیں ——— خلعتِ شاہی کے گل بوٹوں میں وہ جذب و کشش نہیں جو خرقۂ درویش کے پیوندوں میں ہے ——— ایک ایک پیوند لختِ جگر و پارۂ دل بنا ہوا ہے ——— اللہ اللہ کس بلا کا اثر ہے کہ خوش پوشوں نے جامہائے رنگیں تار تار کر ڈالے۔

لیکن اب صورتیں ہی صورتیں ہیں ——— سیرتیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں اور وہ تاثیر مٹتی جا رہی ہے جو قلب و نظر کو کھینچ لیا کرتی تھی اور بساطِ عقل و خرد الٹ دیا کرتی تھی ——— ہم صورت پسند ہیں ——— ہم صورت پرست ہیں ——— ہماری صورت پسندی نے ہمیں کھوکھلا کر دیا اور ہماری صورت پرستی نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا ——— انسانوں کے ٹھاٹ باٹ دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ عقل و دانائی کا جنازہ نکل رہا ہے ——— نہ معلوم یہ جنازہ کب سے نکل رہا ہے! ——— اللہ اللہ خدا نے انسان کو کیا بنایا تھا اور وہ خود کیسے کیا بن گیا ——— لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ——— ہاں وہی انسان جس کو مسندِ عزت پر بٹھایا تھا، قعرِ مذلت میں گرا اور اس گرنے کو معراجِ انسانیت سمجھ بیٹھا ——— متاعِ کارواں بھی لٹ گیا اور احساسِ زیاں بھی جاتا رہا ——— انا للہ وانا الیہ راجعون ——— لیکن وہی ہے جو گرتوں کو تھامتا ہے ——— اسی نے دست گیری فرمائی اور رحمتِ مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابرِ رحمت بن کر چھا گئے ——— انسان انسان کی غلامی سے آزاد ہو گیا ——— شاہوں کے تخت الٹ گئے، خلعتیں پارہ پارہ ہو گئیں ——— جینے مرنے کا سلیقہ آ گیا ——— انسانیت و شرافت کا

بول بالا ہوا ـــــ سیرتوں کو جلا بخشی گئی ـــــ صورتوں پر نکھار آگیا۔

یہ سب کچھ ہوا مگر ہمارا حال عجیب ہے ـــــ خرمنِ سیم و زر کی ہوس ہے ـــــ محلوں کی آرزو ہے ـــــ تختِ سلیماں کی طلب ہے ـــــ اللہ اللہ یہ کیسی طلب ہے اور یہ کیسی آرزو ہے! ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ـــــ لیکن ذرا اُس کی بلند ہمتی اور عالی حوصلگی تو دیکھو کہ اُس نے سیم و زر کے خرمنوں کو ٹھکرا دیا ـــــ اُس کے تن پر خلعت شاہی نہیں، پیوندلگی گدڑی ہے ـــــ وہ محلوں اور قلعوں میں نہیں رہتا ـــــ کچے مکان میں رہتا ہے ـــــ وہ دربار لگا لگا کر نہیں بیٹھتا کوچہ و بازار میں بے تکلف پھرتا ہے ـــــ اس سے ڈر ڈر کر لوگ بھاگتے نہیں دوڑ دوڑ کر قریب آتے ہیں ـــــ وہ انسانوں سے سجدے نہیں کراتا۔ وہ تو راتیں مسجدوں میں گزارتا ہے ـــــ اس نے کبھی خود آگے چل کر اور اوروں کو اپنے پیچھے پیچھے چلا کر انسانیت کو ذلیل و رسوا نہ کیا ـــــ امیر المؤمنین ہوتے ہوئے وہ ایسا عاجز و منکسر المزاج ہے کہ خادموں کا خادم ہے ـــــ اس نے خودی کا وہ درس دیا کہ رہتی دنیا تک یاد رہے گا ـــــ اور سادگی و تواضع کا وہ راستہ دکھایا کہ اب کوئی نمرود و فرعون خدائی کا دعویٰ نہ کر سکے گا۔

چودہ سو برس پہلے کی بات ہے ـــــ بلکہ اس سے بھی کچھ پہلے کی ـــــ دو مسافر شوقِ دید دل میں لئے مکہ سے نکلتے ہیں ـــــ یہ کون ہیں؟ ـــــ کافر و مشرک ـــــ کس کو دیکھنے جا رہے ہیں؟ ـــــ تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ـــــ اللہ اللہ! کہاں مکہ اور کہاں مدینہ طیبہ ـــــ مہینوں اور برسوں کی مسافت ـــــ مگر طلب صادق اور ذوق کامل ہو تو انسان

نہ دبر دین پر کسی ڈال سکتا ہے ـــــ جستجوئے منزل کشاں کشاں لے چلی گئی اور وہ چلتے چلے گئے ـــــ سرد و گرمِ زمانہ سہتے ہوئے سرزمینِ قدس پر قدم رکھا ہے ـــــ مگر وہ جانِ جاں (صلی اللہ علیہ وسلم) اور وہ یارِ غار، رفیقِ وفا شعار (رضی اللہ عنہ) پردہ فرما چکے ہیں ـــــ جس کی طلب تھی وہ نہ ملا، ہاں وہ نہ ملا جس نے مطلوب کی عظمت کا سکہ دلوں میں بٹھا دیا (رضی اللہ عنہ) ـــــ دیکھنے والوں نے دیکھا اور دیکھ کر حیران رہ گئے ـــــ جب غلام کا یہ عالم ہے تو آقا کا کیا عالم ہوگا!

؎

روحِ جبینش صبحِ تجلی
لوحِ جبینش ماہِ تمامے
برقِ نگاہش صد جاں بدامن
زلفِ سیاہش صد دل بدامے
از جسم لرزاں، لرزاں دو عالم
وز زلفِ برہم، برہم نظامے

دل پر وہ اثر ہوا کہ پھر مٹائے نہ مٹا ـــــ داغِ عشق دل پہ لئے مدینہ سے واپس لنکا پہنچے اور جب سینہ کھول کر دکھایا تو بہارِ محبت دیکھنے اہلِ محبت امڈ آئے ـــــ آؤ آؤ، چودہ سو برس پہلے کی فضاؤں میں چلو! ـــــ سنو سنو! یہ کیسی آواز آرہی ہے! :

وانهم وجدوا اصحاب النبي (صلى الله عليه و آله وسلم عمر بن الخطاب وصف لهم تواضعه و انه كان يلبس مرقعه و يبيت في المساجد فتواضعهم لاجل محاكاتهم ذلك الغلام و لبسهم الثياب المرقعة سواء كره من لبس عمر لمرقعة و محبتهم

للمسلمین ومیلهم الیهم لما فی قلوبهم مما حکاه ذلک

الغلام عن عمر لہ

(ہندوستان کی ایک شہر آرہ ، مجاہد مسیحا جادو بیانی ہندوستانی ہیروں کی نظر میں ؛ مسعود عالم ندوی ،

سید ہماگڑھ ستمبر ص ۲۰۵)

(ترجمہ) " اور وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ——— کے صحابی عمر بن الخطاب سے ملے ——— ان کی تواضع کا یہ عالم ہے کہ پیوند لگے کپڑے پہنتے ہیں اور مسجد میں راتیں گزار دیتے ہیں ——— یہ سن کر وہاں کے لوگ از راہِ انکساری پیوند لگے کپڑے پہننے لگے کہ عمر بھی تو پیوند لگے کپڑے پہنتے ہیں ——— مسلمانوں سے ان کو الفت ہو گئی اور اس (مسافر) لڑکے سے حضرت عمر کی باتیں سن سن کر مسلمانوں کی طرف ان کا دل کھنچنے لگا ۔"

محبت دل میں گھر کر جائے تو محبوب کی سی صورت بنانے اور محبوب کا سا لباس پہننے کو جی چاہتا ہے اور اسی میں مزہ آتا ہے ——— اللہ اللہ وہ کافر و مشرک تھے لیکن رازِ محبت سے آشنا تھے ——— ہم مومن و مسلم ہوتے ہوئے بھی اس راز سے بیگانہ ہیں ——— عشق کا دم بھرتے ہیں لیکن محبوب کی سی صورت بناتے اور محبوب کا سا لباس پہنتے شرم آنے لگی ہے ——— شاید عشق و محبت کی دنیا کا یہ تجربہ ——— نہیں نہیں ! یہ المیہ کسی نے نہ دیکھا ہو گا ——— اے صورت پسندو ! اور ہاں صورت پرستو ! ——— ان کفار و مشرکین سے سبق لو کہ جنونِ عشق میں اپنے پیرہن تک چاک کر ڈالے ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی

دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

اہل اللہ اور اہلِ دنیا

انسان کا حال یہ ہے کہ جب غرض ہوتی ہے تو ایک آید کے آگے پیچھے پھرتا ہے ——— غرض پوری ہو جاتی ہے تو منہ پھیر لیتا ہے ——— محسن و کرم فرما کو بھول جاتا ہے ——— پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں۔

زمانے میں شب و روز آتے رہتے ہیں ——— کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں بڑی ——— زمانہ ایک حالت پر نہیں رہتا ——— ایسا بھی ہوا ہے کہ داتا منگتا بن گئے ——— اور یہ بھی ہوا ہے کہ منگتا داتا بن گئے ——— لیکن جب وہ منگتا تھا تو داتا کے آگے پیچھے پھرتا تھا اور اب جبکہ خود داتا بن گیا ہے اور داتا منگتا ہو گیا ہے ——— مڑ کر بھی نہیں دیکھتا ——— یہ کیسی احسان فراموشی ہے؟ ——— یہ کیسا انقلاب ہے؟ ——— لیکن اہلِ دنیا یہی کرتے ہیں۔

اہلِ دنیا کا حال دیکھ چکے ——— آؤ اب اہل اللہ کا حال دیکھو ——— اپنی جان کے لئے ضرورت ہوتی ہے تو مولیٰ تعالیٰ پر تکیہ کئے پڑے رہتے ہیں ——— کسی کے پاس نہیں جاتے ——— کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے ——— لیکن کسی کو اُن کی ضرورت ہوتی ہے تو دوڑ کر اس کی حاجت روائی کے لئے پہنچتے ہیں ——— اپنا تن، من، دھن سب کچھ قربان کر دیتے ہیں ——— ہاں یہی انسانیت کی آبرو ہیں ——— ہاں یہی خلافت کا سنگھار اور شرافت کا نکھار ہیں ——— انہیں کے دم سے دنیا کائنات ہے ——— خود غرضی اور حرص و آز کی تاریکیوں میں یہی اجالا ہیں ——— یہ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہیں ——— یہ ہر ایک درد کا مداوا ہیں ——— یہ آبِ حیات ہیں ——— یہ اکسیر و تریاق ہیں۔

کامیابی و ناکامی

کھیل کی دنیا میں دیکھئے کیسے کیسے تماشے نظر آتے ہیں ——— چند خود ساختہ اصول ہیں اور ایک غریب گیند ——— اِدھر اُدھر لڑھکتی پھر رہی ہے ——— لڑھکا بھی رہی ہے ——— لوگ ہیں کہ اس کی ایک ایک ادا پر

شور ہو رہے ہیں ــــــ ایک ہنگامہ برپا ہے. قیامت کا شور ہے ــــــ کان پڑی آواز نہیں آرہی ہے ــــــ کیا ہوا! ــــــ کھیل ختم ہوا ــــــ ایک ناکام ہوا ــــــ ایک کامیاب ہوا ــــــ ایک کو کندھوں پر اٹھایا جا رہا ہے، سر پر بٹھایا جا رہا ہے ــــــ گلے لگایا جا رہا ہے ــــــ اور وہ دوسرا شرم کر یہ سارا تماشا دیکھ رہا ہے ــــــ جان پہ بنی ہے لیکن کھسیانی ہنسی ہنس رہا ہے کہ ناامرادوں کو بھی ہنسنا چاہیے۔

ہاں وہ کیوں شاد ہیں اور یہ کیوں ناشاد ہے ــــــ ہاں وہ کیا کامیاب ہیں اور یہ کیوں ناکام؟ ــــــ یہ خود ساختہ اصولوں کی بات ہے ــــــ دونوں نے تسلیم کئے ہیں اس لئے سر نیاز خم کرنا پڑے گا ــــــ بیشک، ایسا ہی کرنا چاہیئے ــــــ لیکن جب خود ساختہ اصولوں کے مقابلے میں بات نہ ساختہ اصولوں کی ہوتی ہے تو پھر عقل کیوں جواب دے جاتی ہے؟ ــــــ خدا نے یہ پوچھا ــــــ "کیا ہم تمہارے رب نہیں؟" ــــــ سب نے کہا ــــــ "ہاں ہاں تو ہی ہمارا رب ہے!" ــــــ اعلان فرمایا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ــــــ

زندگی کا کھیل شروع ہوا ــــــ کامیاب بھی ہوئے، ناکام بھی ــــــ لیکن کچھ کھلاڑیوں کی عقل پر پتھر پڑ گئے ــــــ کہتے ہیں ہم نہ مانیں گے ــــــ اللہ اللہ! خدا کے بنائے ہوئے اصول نہ مانوگے اور اپنے بنائے اصول مانوگے؟ ــــــ یہ کیسا ظلم ہے؟ ــــــ یہ کیسا اندھیر ہے؟ ــــــ اے کھلاڑیو! تمہاری عقل کو کیا ہو گیا؟ ــــــ دل تو لٹا ہی تھا، عقل کی خبر لو کہ وہ بھی لٹ رہی ہے!

مقتول و معزول

کیا کچھ نہ تھا ــــــ حفاظتِ جان اور آرامِ جاں کے لئے سب ہی کچھ میسر تھا ــــــ لیکن جس کو خدا مارنا چاہے اس کو کوئی ایک آن زندہ نہیں رکھ سکتا ــــــ اور جس کو خدا جلانا چاہے، کوئی نہیں مار سکتا ــــــ حفاظت کے ظاہری اسباب حکمِ الٰہی کے آگے نابود ہو کر رہ جاتے ہیں۔

کس شان سے سواری چلی ——— دیدنی تھی، شنیدنی تھی ——— کیل کا کھٹکا نہ تھا ——— کیل کانٹے سے لیس ہر طرف چاق و چوبند فوجی جوان ——— خفیہ پولیس کے جوان الگ مصروفِ کار ——— سب اپنا اپنا فرض ادا کر رہے ہیں ——— اور ایک جان کی حفاظت کے لئے، ایک عالم سرگرداں ہے ——— مگر ملک الموت نے اس کو تاک لیا ہے ——— دیکھنے والے حیران ہیں ——— کیا ایسا بھی ممکن ہے؟ ——— ہاں ایسا ہی ہو کر رہے گا ——— آن کی آن میں ایک گولی نکلی اور اس جانِ ناتواں کا کام تمام کر گئی جس کی حفاظت میں سب لگے ہوئے تھے ——— یہ کون تھا؟ ——— یہ امریکہ کا مشہور صدر آنجہانی کینیڈی تھا۔

موت برحق ہے ——— آنی ہے، خواہ ہم بند کمروں اور بند گنبدوں میں جا بیٹھیں ——— ایک مجلس میں ایک اسسٹنٹ کمشنر صاحب تشریف فرما تھے ——— یہ فقیر بھی حاضر تھا ——— کہنے لگے "اگر حضرتِ عمرِ فاروق (رضی اللہ عنہ) اپنی جان کی حفاظت کے لئے پولیس کا اہتمام کرتے تو یوں شہید نہ ہوتے اور اسلام کے لئے بہت کچھ کر سکتے تھے" ——— جب موت کی عظیم حقیقت نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے تو انسان اسی طرح سوچا کرتا ہے ——— افسوس جب ہم زندگی کی بات کرتے ہیں تو موت کو فراموش کر دیتے ہیں ——— سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ شاہانہ کروفر ایک تماشا ہے ——— موت کے آگے کسی کی پیش نہیں چلتی ——— آن کی آن میں خاک میں ملا دیا جاتا ہے ——— پھر یہ ظاہری شان و شوکت حرکتِ طفلانہ نہیں تو اور کیا ہے؟

مقتول کی داستانِ خونچکاں سن چکے ——— اب معزول کی عبرت انگیز کہانی سنو ——— یہ دنیا عبرت کدہ ہے ——— یہاں عبرت حاصل کرو!

——— خدا تو دیکھتا ہی ہے لیکن زندہ قومیں اپنے حاکموں پر نگران رہتی ہیں ———

——— ان کو من مانی نہیں کرنے دیتیں ——— ان کے بہلاوے یا فریب میں نہیں آتیں ——— ان میں گریبان پکڑنے کا حوصلہ ہوتا ہے ——— وہ بت پرست نہیں ہوتیں بت شکن ہوتی ہیں ——— اور جب اقتدار کے نشے میں حاکم اعلیٰ کچھ الٹا سیدھا کر بیٹھتا ہے تو وہ قوم اس کا دامن پکڑ کر تار تار کر دیتی ہے ——— پھر وہ ہکا بکا رہ جاتا ہے ——— اور نشہ ہرن ہو جاتا ہے ——— عتابِ غفلت سے بیدار ہو جاتا ہے ——— آنکھیں کھل جاتی ہیں ——— بہت ہاتھ پیر مارتا ہے مگر نکل نہیں پاتا ——— جس قوم میں احتساب کی یہ جرأت ہو، وہ غلام نہیں رہ سکتی۔

نکسن معزول ہوا اور عروج و زوال کی یادگار بن کر رہ گیا ——— زوال آیا تو آنکھیں کھلیں اور بے ساختہ پکار اٹھا ——— "ہاں اب پستیوں میں بلندیوں کا شدید احساس ہو رہا ہے" ——— ایک بڑی نفسیاتی حقیقت بیان کر گیا ——— لیکن جو بلندیوں میں بھی پستیوں کا احساس رکھتے ہیں ——— کبھی پستیوں سے ہمکنار نہیں ہوتے ——— بلندیاں ان کا مقدر ہو چکی ہیں۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب دیکھو اپنے سے نیچے دیکھو بلندیوں پر شکر کرنے کو جی چاہے ——— اللہ اللہ عظمت کا کیسا اچھا گر بتا دیا ——— فقیری میں شاہی کا مزا چکھا کر شاہوں کو فقیری کا رسیا بنایا۔

کاغذی مہرے ایک وہ ہیں جو کاغذ پر زندہ رہتے ہیں اور کاغذ ہی پر مرتے ہیں ——— اور ہاں ایک وہ ہیں جو دل میں زندہ رہتے ہیں ——— جو مرتے نہیں ——— وہ مرنے کے لئے نہیں، زندہ رہنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔

بساطِ سیاست پہ کیسے کیسے مہرے نظر آئے ——— بہت سوں کی زندگی صحافت کی مرہونِ منت رہی ——— جب تک اخبارات میں ذکر و اذکار ہوتے رہے ——— وہ زندہ رہے ——— ذکر و فکر نہ رہا تو مر گئے ——— زندہ تو اب بھی

ہیں لیکن یوں معلوم ہوتا کہ مرے ہوئے برسوں گزر گئے ——— ہاں نیک انسان اپنی نیکیوں سے زندہ رہتا ہے۔

اہل اللہ کو دیکھو ——— اُن کی زندگی ——— اُن کی نیک نامی ——— اُن کی شہرت ——— اُن کی عظمت ——— اخبارات کے سہارے نہیں، اُسی کے سہارے ہے جو بے سہاروں کا سہارا ہے ——— کہیں ذکر و فکر نہیں لیکن ایک عالم ہے کہ کھنچا چلا آرہا ہے ——— ایک جہاں ہے کہ امڈا چلا آرہا ہے ——— اِن پاک ہستیوں کو دیکھو اور پھر اُن کاغذی مہروں کو دیکھو ——— ایک ایک آن کی خبر چھپتی تھی ——— وہ آرہے ہیں، یہ جارہے ہیں ——— یہ جل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں ——— یہاں شاندار استقبال ہو رہا ہے اور وہاں شاندار استقبال ہوگا ——— سبحان اللہ! استقبال ہونے سے پہلے علمِ غیب بھی حاصل ہو جاتا ہے! ——— ہاں شاندار استقبال بھی ہوئے ——— شاندار جلوس بھی نکلے ——— شاندار جلسے بھی ہوئے ——— اور جب نظروں سے اوجھل ہوئے ——— اخبارات سے اٹھے تو گویا جہاں سے اٹھ گئے ——— سچ کہا ہے ؎

سارا سودا ہے جیتے جی کا

جب زندگی کاغذی ٹھہری تو کاغذ ہی پر بدنام ہوتے ہیں ——— کاغذ ہی پر نیک نام ہوتے ہیں ——— کاغذ ہی پر محبوب بنتے ہیں ——— کاغذ ہی پر مردود ہوتے ہیں ——— غرض ان کا اوڑھنا بچھونا کاغذ ہے ——— کہیں غالب نے ان کے لئے تو نہیں کہا ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اور ہاں اُن کی زندگی کا حال کیا پوچھتے ہو جو مرتے ہیں تو اور زندہ ہو جاتے

ہیں ــــ بُھلائے جاتے ہیں تو اور یاد کئے جاتے ہیں ــــ اُن کے سر پر خدا کا سایہ ہے ــــ اُن کے دل میں خدا کا گھر ہے ــــ وہ نہ کسی اخبار کے مرہونِ منت ہیں اور نہ کسی اور ذریعۂ ابلاغ کے ــــ نہ اُن کو شاندار استقبال کی ضرورت نہ جلسے جلوس کی حاجت ــــ نہ قصیدہ خوانی کی ضرورت اور نہ چکنی چپڑی باتوں کی حاجت ــــ وہ سچا ہیرا ہیں ــــ جھوٹے نگینے نہیں ــــ وہ خود چمکتے ہیں ــــ چمکائے نہیں جاتے ــــ وہ خود بڑھتے ہیں ــــ بڑھائے نہیں جاتے ــــ وہ خود اٹھتے ہیں ــــ اٹھائے نہیں جاتے ــــ ان کو وہی چمکاتا ہے جس نے شمس و قمر چمکائے ــــ وہی اٹھاتا ہے جس نے بازارِ طائف میں تاجدارِ مدینہ کو اٹھایا ــــ اور ایسا اٹھایا کہ آج تک دنیا اس کی اٹھان دیکھ رہی ہے ؎

ورفعنا لک ذکرک کا ہے سایہ تجھ پر

بول بالا ہے ترا، ذکر ہے اونچا تیرا

جس طرح شمیمِ چمن ہواؤں کے دوش پر پھیلتی چلی جاتی ہے ــــ وہ پھیلتے چلے گئے ــــ دماغوں کو معطر کر دیا اور دلوں کو مست کر دیا ــــ صورت کا تناتا پردہ ایسے حسین و جمیل نقش تھے کہ نظروں میں کھبتے چلے گئے۔

ہاں اے ظاہر پرستو! آؤ مجاز کا انجام دیکھو اور حقیقت کا اعجاز دیکھو ــــ اور پھر بتاؤ کہ زندگی کاغذی مہروں میں پائی یا حقیقی پیکروں میں دیکھی؟

خادم و مخدوم

ہوا نہ ہو تو ہم نہ رہیں ــــ پانی نہ ہو تو ہم نہ رہیں ــــ رزق نہ ہو تو ہم نہ رہیں ــــ آخر ہم ہیں کیا جو قدم قدم پر گرتے جاتے ہیں؟ ــــ کہتے ہیں عناصرِ اربعہ خادم ہیں! انسان مخدوم ہے ــــ لیکن خادم کے بغیر مخدوم گزر بسر کر سکتا ہے ــــ یہ کیسے خادم ہیں کہ ان کے بغیر مخدوم چل بستا ہے

اور ایک لمحہ زندہ نہیں رہ سکتا! ——— مخدوم کا کمال یہ ہے کہ خادم کے بغیر زندہ رہ کر دکھائے اور یہ بتادے کہ مخدوم، خادم کا محتاج نہیں ——— خادم، مخدوم کا محتاج ہے۔

دیکھو دیکھو وہ عالم کا سرتاج ہفتوں نہ کچھ کھاتا ہے نہ پیتا ہے ——— سمجھنے والے یہی سمجھتے ہیں کہ شاید یہ کوئی آسان کام ہے ——— شاید یہ کوئی آسان منزل ہے ——— لیکن قدم رکھتے ہی تو لڑکھڑا جاتے ہیں ——— دیکھو وہ رحمۃ للعالمین ان سے کیا فرمارہا ہے ——— "اے تم نے یہ کیا کیا! تم سحری بھی کرو، تم افطار بھی کرو، تم میں مجھ جیسا کون ہے! ——— میرا رب مجھ کو پلاتا ہے، میرا رب مجھ کو کھلاتا ہے" ع

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا!

ہم اس کے کرم خاص سے ہواؤں پر حکومت کرتے ہیں ——— ہم دریاؤں پر حکومت کرتے ہیں ——— ہم زمین پر حکومت کرتے ہیں ——— ہم اس کا دیا رزق کھاتے ہیں!

اُن کو دیکھ چکے جن کو نہ کوئی دیکھ سکا اور نہ سمجھ سکا ——— آؤ خود کو دیکھو ———

ہم عناصرِ اربعہ کے محتاج نہیں کہ یہ احتیاج فطری ہے اور اس کا دفع کرنا بڑی اولوالعزمی کی بات ہے ——— ہمارا حال یہ ہے کہ غیر فطری احتیاجات نے ہم کو محتاج بنا کر رکھ دیا ہے ——— مخدوم تھے خادم بنکر رہ گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون ——— کن کن احتیاجات کا ذکر کیا جائے؟ ——— ایک طویل فہرست ہے ——— افسوس ہماری زندگی احتیاجات کی نذر ہوگئی ——— ہمیں شاندار محلوں کی ضرورت ہے ——— نت نئے کپڑوں کی ضرورت ہے ——— لمبی چوڑی کاروں کی ضرورت ہے ——— رنگا رنگ کھانوں کی ضرورت ہے ——— فوج در فوج نوکروں کی ضرورت ہے ——— اپنی تعریف و توصیف کی ضرورت ہے ——— اَن گنت دولت کی ضرورت ہے ——— الغرض ضرورت ہی ضرورت ہے ——— اللہ اللہ! یہاں امارت کے لبادے میں کیسے کیسے فقیر بستے ہیں!

——— معلوم ہوتا ہے جیسے منگوں کی گنگی ہے۔

اور یہاں دیکھو دیکھو وہ بھی ہیں جنہیں نہ شاندار محلوں کی ضرورت، نہ لمبی چوڑی کاروں کی ضرورت، نہ رنگا رنگ کھانوں کی ضرورت، نہ فوج در فوج ملازموں کی ضرورت ——— وہ کچے مکانوں میں رہتے ہیں، موٹا جھوٹا پہنتے ہیں، سیدھا سادا کھاتے ہیں ——— وہ اس بے نیاز کے ہو گئے جس نے کائنات سے ان کو بے نیاز کر دیا ——— ہاں ہاں جہاں وہ رہتے ہیں وہ پیروں کی نگری ہے ——— مخدوموں کی نگری ہے ——— خادموں اور مسکینوں کی نہیں۔

باشعور و بے شعور

باشعور رہ کر زندگی گزارنا سخت اذیت ناک و کربناک ہے ——— بے شعوری کے ساتھ زندگی گزارنا نہایت آسان ہے بلکہ طربناک ——— بچوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے مست رہتے ہیں؟ ——— مستوں کو نہیں دیکھتے کیسے شاد رہتے ہیں؟ ——— ہاں غفلت کی زندگی نہایت آسان ہے ——— لیکن یہ زندگی، زندگی نہیں ——— اور ہاں اس زندگی میں بھی جب کوئی فکر لگ جاتا ہے ——— آخرت کا نہیں دنیا کا ——— تو اس فکر بے شعوری سے بھی انسان کا دل بیٹھنے لگتا ہے ——— کلیجہ منہ کو آجاتا ہے ——— ایک ایک قدم پہاڑ معلوم ہونے لگتا ہے ——— زندگی اجیرن ہو جاتی ہے ——— ہارٹ فیل ہو جاتا ہے ——— شرشہ انسان کیا بے قصد ہے کہ بے شعوری اور غفلت کو ساری زندگی دے بیٹھا! ع

فریب سود و زیاں لا الٰہ الا اللہ

اور دیکھو ——— یہاں ان کو دیکھو جن کی زندگیاں شعور و حس کی زندگیاں ہیں ——— جو رہتے ہیں ——— ان کے دل نے ان کو بہت کچھ بتایا ہے ——— وہ ہم کو معلوم ہوا ہے جو ان کو معلوم ہے تو تپ دق ہو جاتے ہیں جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ——— مگر نہیں ان کے توصف دیکھو ——— ان کی ہمتیں دیکھو کہ سینے میں ...

کے ہنگامے چپلائے بیٹھے ہیں ——— شعور و ہوش کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیامت ہے ——— مگر وہ اس خوبی سے گزار جاتے ہیں کہ سبحان اللہ! سبحان اللہ! ——— اُن کی ہمت تو دیکھو ——— جس غمِ روزگار نے ہماری زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے وہ ان کے قریب بھی نہ پھٹکے بلکہ انہوں نے پھٹکنے نہ دیا ——— جس کھیل میں ہم نے گنوائی، اس کھیل میں وہ شریک نہ ہوئے ——— انہوں نے زندگی کو پالیا، منزل کو جالیا ——— ہم سو کر بھی آرام نہ پا سکے ——— ان کو دیکھو جاگ کر وہ آرام پا لیا کہ سونے والے نہ پا سکے ——— آفریں صد آفریں!

درجہ بدرجہ پہلے چراغ جلتے تھے ——— لالٹین آئی تو وہ گُل کر دیئے ——— لیمپ آئے تو لالٹین بجھا دی ——— اور فانوس آیا تو لیمپ گُل کر دیئے ——— پھر بجلیاں چمکیں تو فانوس بجھا دیئے ——— اور جب آفتاب عالمتاب طلوع ہوا تو سب چراغ گُل ہو گئے۔

لالٹین آئی تو چراغ کیوں نہ جلایا؟ کہ چراغوں میں وہ روشنی نہ رہی ——— لیمپ آئے تو لالٹین کیوں بجھا دی گئی؟ کہ اس کے آگے اس کی پیش نہ چلی ——— فانوس آیا تو لیمپ کیوں گُل کر دیئے گئے کہ لیمپ کی روشنی ماند پڑ گئی ——— بجلیاں چمکیں تو فانوس کیوں بجھا دیئے گئے؟ ——— کہ فانوس میں وہ زندگی نہ رہی ——— آفتابِ جہانتاب طلوع ہوا تو بجلیوں کو کس کی نظر کھا گئی؟ ——— وہ اپنی موت خود مر گئیں۔

ہاں روشنی کی تلاش میں ہم آگے بڑھتے گئے اور نئی نئی روشنیوں کا استقبال کرتے گئے ——— لیکن جب بات دل کی روشنی کی چلی تو عقلیں کیوں پٹ ہو گئیں! اور بات کیوں سمجھ میں نہ آئی؟

دیکھو دیکھو وادیٔ فاران سے آفتابِ عالمتاب طلوع ہو رہا ہے ———

اے چراغ کے متوالو! ——— چراغ گُل کر دو ——— اور ہاں اے فانوس کے دلدادو! ——— فانوس بجھا دو ——— اور اے برق کے پرستارو! ——— بجلیاں گُل کر دو۔

مگر تم کو کیا ہو گیا؟ آفتاب چمک رہا ہے، تم دیئے جلا رہے ہو؛ تم فانوس روشن کر رہے ہو! تم بجلیاں جلا رہے ہو! تمہاری عقلوں پر پتھر پڑ گئے ——— تم یہ کیا کر رہے ہو؟ ——— جب تم نے بجلیوں کے پیچھے چراغوں کو چھوڑا ——— آفتاب کے پیچھے بجلیوں کو چھوڑا ——— تو اب کیا ہو گیا؟ ——— ہاں اے عقل پرستو! عقل کی بات کرو ——— دیکھو دیکھو کہیں عقل نذرِ جنوں نہ ہو جائے۔

آگے اور پیچھے

ٹرین میں سوار ہو ——— بس میں سوار ہو ——— کار میں سوار ہو ——— جہاز میں سوار ہو ——— یا پیادہ چل رہا ہو ——— کسی بھی حالت میں ہو، انسان ہمیشہ آگے ہی دیکھتا ہے، پیچھے نہیں دیکھتا ——— یہ اس کی فطرت ہے ——— یہ اس کی عادت ہے ——— کبھی پیچھے دیکھتا بھی ہے تو تکلفاً دیکھتا ہے، عادۃً نہیں دیکھتا۔

تاریخ کا مطالعہ کیجئے، دو قسم کے انسان نظر آئیں گے، ایک وہ جو آگے دیکھ رہے ہیں اور ایک وہ جو پیچھے دیکھ رہے ہیں ——— جنہوں نے پیچھے دیکھا ناکام ہوئے ——— جنہوں نے آگے دیکھا، کامیاب ہوئے۔

مگر دنیا والوں کا حال فطرتِ انسانی کے خلاف ہے ——— ان کی نظر آگے نہیں رہتی ——— وہ ہمیشہ پیچھے دیکھتے ہیں ——— وہ دنیا دیکھتے ہیں، ان کو آخرت نظر نہیں آتی ——— اور جن کو نظر آتی ہے اُن کی ہنسی اڑاتے ہیں ——— اللہ اللہ! پیچھے دیکھنے والے، آگے دیکھنے والوں پر ہنس رہے ہیں! ——— اِن کی عقلوں کو کیا ہو گیا؟ ——— اے عقل کے دشمنو! آؤ آؤ، دینِ فطرت پکار رہا ہے ——— دیکھو دیکھو، وہ رحمتِ عالم آگے دکھا رہا ہے ——— بہت آگے ——— دیکھنے والے اُس کی نظر کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوئے جاتے ہیں ——— بعض اہلِ ہمت اُس کی طرف لپک رہے ہیں اور بعض بدبخت دامن بچا کر نکل رہے ہیں۔

اے قافلہ والو! دیکھنا سالارِ کارواں سے منہ نہ موڑنا ——— نشانِ قدم چومتے چلو ——— ہاں بڑھتے چلو ——— چلتے چلو کہ زندگی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

سازِ خیال ساز کو مضراب لگائیے تو بجنے لگتا ہے ——— کبھی مسلسل بجتا ہے، کبھی رُک رُک کر ——— خیال بھی ساز سے کم نہیں ——— حادثہ یا احساس مضرابِ خیال ہے ——— کبھی مضرابِ مسلسل، کبھی مضرابِ غیر مسلسل ——— کبھی چاندنی رات ہوتی ہے، کبھی چاند بدلی سے نکل کر چھپ جاتا ہے ——— کبھی موسلا دھار بارش ہوتی ہے، کبھی بوندا باندی ہو کر رہ جاتی ہے ——— کبھی پھوار پڑتی ہے، کبھی اوس سی معلوم ہوتی ہے۔

مگر سازِ خیال یونہی نہیں بجنے لگتا ——— یہ جب بجتا ہے جب خوابیدہ قوتیں بیدار ہوتی ہیں ——— جب دماغ کو جھنجھوڑا جاتا ہے ——— جب خونِ جگر پلایا جاتا ہے ——— جب فضلِ باری ہوتا ہے ——— جب قلب و نظر کے پردے ہٹائے جاتے ہیں ——— جب روح کو جگایا جاتا ہے۔

ہاں سازِ خیال کی آواز کوئی نہیں سنتا ——— لیکن جب یہ صدائے بے آواز جامۂ حروف زیبِ تن کئے سندِ قرطاس پر جلوہ گر ہوتی ہے ——— تو پھر آنکھ دیکھتی ہے ——— منہ بولتا ہے، کان سنتے ہیں ——— دل کھلتا ہے ——— روح وجد میں آنے لگتی ہے ——— کائنات کا رنگ بدلا بدلا سا نظر آنے لگتا ہے۔

کتابیں اسی سازِ خیال اور نغمہ بے آواز کے ریکارڈ ہیں جو قلب و دماغ کی مشین پر چڑھائے جاتے ہیں ——— سوزنِ نگاہ سے چلائے جاتے ہیں ——— اور زبانِ معجز بیان سے بجائے جاتے ہیں۔

تقلید و اجتہاد انسان مقلد بھی ہے اور مجتہد بھی ——— لیکن آغازِ سفر اجتہاد سے نہیں تقلید سے کرتا ہے ——— یہ اس کی فطرت ہے ——— اور تقلید ہی کو بُرا کہتا ہے ——— یہ اس کی عادت ہے۔

کرۂ ارض پر پہلا خون ہوا تو وہ ایک پرندہ ہی تھا جس نے قاتل کو بتایا کہ مقتول کو کس طرح دفن کیا جائے ——— قرآنِ کریم نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے ——— شاید نوعِ انسانی میں یہ قاتل پہلا مقلد تھا۔

دورِ جدید میں سائنس کی دنیا کی سیر کیجئے ——— یہاں سارے مجتہد مقلد نظر آئیں گے ——— ہمارے سروں پر برسوں سے جہاز اُڑ رہے ہیں ——— شاید یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ پرندہ ہی تھے جنہوں نے انسان کے خیال کو اس طرف متوجہ کیا ——— ایک چڑیا کی کیا اوقات ہے لیکن وہ مقلدین کی امام ٹھہری ——— چڑیوں کے ڈھانچوں پر غور و فکر کیا گیا اور آخرِ کار جہاز بنا ڈالا ——— تقلید کے بعد اجتہاد کا دَور شروع ہوا اور بات کہاں سے کہاں تک پہنچی۔

اور سنیئے! ——— جہاز تو بنا لیا لیکن یہ کس نے بتایا کہ اس کے ذریعہ حملہ بھی کیا جا سکتا ہے؟ ——— اس خیال کی طرف سورۂ فیل نے رہنمائی کی اور یہ بتایا کہ خدا کی قدرت سے ابابیلوں نے آن کی آن میں اصحابِ فیل کو تہس نہس کر کے رکھ دیا ——— ستر اسّی برس پہلے جب یہ بات سمجھ میں آئی تو مفسرین نے نئے نئے گل کھلائے ——— سر سید نے لکھا کہ عرب میں چیچک کی وبا پھیلی تھی ——— سورۂ فیل میں چیچک کے دانوں کو کنکریوں سے تشبیہ دی ہے، سبحان اللہ! ——— زمانہ گزرتا گیا اور آنکھیں کھلتی گئیں اور بالآخر انسان خود اس آیت کی جیتی جاگتی تفسیر بن گیا اور کسی تاویل کی گنجائش ہی نہ رہی۔

وائرلیس کے ذریعہ پیغام رسانی ایک عام بات ہے لیکن یہ گُر بھی ایک معمولی جھینگر نے بتایا ——— غور کیا گیا، تو معلوم ہوا کہ یہ حقیر جانور اپنی لمبی لمبی مونچھوں کے ذریعہ پیغام رسانی کا کام کرتا ہے اور میلوں پرے اپنے رفیقوں کو پیغام پہنچا دیتا ہے ——— انسان اپنی مونچھوں سے تو پیغام نہ پہنچا سکا البتہ غور و فکر کے بعد بہت کچھ سیکھ لیا۔

ریڈار سے دشمن کے جہازوں کو معلوم کرنا ایک جانی پہچانی حقیقت ہے ———

لیکن یہ بات کس نے سمجھائی؟ ـــــ آپ کو علم ہوگا تو حیران رہ جائیں گے ـــــ ایک چمگادڑ انسان کی معلم بنی اور وہ سب کچھ سکھادیا جو انسان کو نہ آتا تھا ـــــ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ الو کا پرندہ اپنے منہ سے برقی شعلہ چھوڑتا ہے جو بلا کی تیزی کے ساتھ رات کی تاریکی میں ہر اس چیز کے ساتھ ٹکرا کر واپس آجاتا ہے جو اس کی راہ میں حائل ہوتا ہے ـــــ اس طرح یہ تاریکیوں میں بھی ٹکرائے بغیر اڑتی پھرتی ہے۔

قرآنِ کریم نے مخلوقات میں غور و فکر کی دعوت دی ہے ـــــ آپ نے دیکھا کہ انسان غور و فکر سے کہاں سے کہاں تک پہنچا ـــــ لیکن یہ اس کی کم ظرفی ہے، تقلید کا ذکر نہیں کرتا، اجتہاد کا ذکر کرتا ہے حالانکہ حقیقۃً وہ مقلد ہے، تقلید کے بغیر چارۂ کار نہیں، بینا دو بصر ہے۔

اور ہاں جب انسان حکیمانہ نظر سے مادی دنیا میں اس بلندی تک پہنچ سکتا ہے تو غور کرو کہ عارفانہ نظر سے روحانی دنیا میں کہاں سے کہاں تک پہنچ سکتا ہے! ـــــ ایک سلسلہ ہے جو بلندیوں پر نظر آرہا ہے ـــــ مادیت کی طرف جانے والو! روحانیت کی اِن بلندیوں کی طرف چلو ـــــ غور و فکر کی وہ راہیں اختیار کرو جو گردابِ بلا سے نکال کر ساحلِ مراد تک پہنچادیں۔

فرضِ شریعت و فرضِ محبت

ـــــ ایک فرضِ شریعت ہے ایک فرضِ محبت ـــــ روزہ فرض ہے، اس لئے رکھ رہے ہیں ـــــ نماز فرض کردی گئی، اس لئے پڑھ رہے ہیں ـــــ جہاد فرض کردیا گیا، اس لئے لڑرہے ہیں ـــــ زکوٰۃ فرض کردی گئی، اس لئے دے رہے ہیں ـــــ حج فرض کردیا گیا، اس لئے کررہے ہیں ـــــ مگر اس روزہ رکھنے، نماز پڑھنے، جہاد کرنے، زکوٰۃ دینے اور حج کرنے میں محبت کی بو نہیں آرہی ـــــ اسلام سراسر محبت ہے ـــــ یہاں محبت کے علاوہ کسی کی پوچھ نہیں ـــــ خوب سمجھ لو جو فرضِ شریعت ہے، وہی فرضِ

محبت ہے ——— محبت کی نگاہ سے دیکھو، محبت ہی کی نگاہ سے عمل کرو ———
عبادت کو ملازمت نہ سمجھو ——— عبادت کو تجارت نہ بناؤ ——— عبادت محبت
ہی محبت ہے ——— محبت کو رسوا نہ کرو۔

لوگ سنّت کو محض سنت سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں ——— ڈاڑھی ایک اہم اور
ایک عظیم سنّت ہے ——— ایسی سنت اور ایک ایسی نیکی جس کا فیض ہر وقت جاری و ساری
ہے ——— نماز کا ایک وقت ہے ——— روزے کا ایک مہینہ ہے ———
حج کا ایک زمانہ ہے ——— زکوٰۃ کی ایک شرط ہے ——— لیکن جس کا کوئی وقت
نہیں ——— جس کا کوئی مہینہ نہیں ——— جس کا کوئی زمانہ نہیں اور جس کے لئے
کوئی شرط نہیں ——— ڈاڑھی وہ سنت ہے ——— اس سنت کا فیض ہر وقت
جاری ہے کہ یہ ہر آن باقی ہے ——— اللہ اللہ! کیسی عظیم نیکی ہے لیکن ہم نے اس طرح
چھوڑ دیا جیسے یہ کچھ ہے ہی نہیں۔

ایک دوست سے جب عرض کیا گیا، فرمایا: ——— "سنت ہی تو ہے!"
——— اے دوست! تو نے یہ کہہ کر محبت کا کیسا مذاق اڑایا ہے ——— کسی عاشق
کو نہ دیکھا کہ اس نے اپنے محبوب کی بات کو ہلکا سمجھا ہو ——— محبت تو محبوب کی
اک اک ادا پر مرمٹنے کا نام ہے۔

ہمیں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ مبارکہ کا پورا علم ہے اور یہ وہ علم ہے
جو دنیا کے کسی مذہب کو اپنے پیشوا کے بارے میں حاصل نہیں ——— اب کیا یہ ضروری
ہے کہ ایک ایک بات کے لئے حکم کا انتظار کریں اور پھر حکم کی نوعیت پر بحث کریں!
——— محبت کہتی ہے ——— اے عاشقو! اس کے رنگ میں رنگ جاؤ، یہ
فرضِ محبت ہے ——— ہاں انتظار نہ کرو کہ محبت انتظار نہیں کرتی، وہ تو گزر جاتی ہے

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

معقولیت

نہ معلوم نوجوانوں کو کیا ہو گیا اور ان کے عقل و شعور پر کس نے شبخون مارا ——— ہر نامعقول بات معقول اور ہر معقول بات نامعقول نظر آنے لگی ——— لباس ہی کو لیجئے ——— سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کرتہ زیبِ تن فرمایا ——— ڈھیلا ڈھالا، سیدھا سادا اور آرام دہ ——— اس کے مقابلے میں اپنا لباس دیکھئے ——— لباس غلاف بن کر رہ گیا ہے ——— کرتے کی جگہ بے شمار چیزیں آگئی ہیں اور پتلون اتنی چست کہ ٹانگیں حرکت سے محروم ——— اللہ اللہ! ان کی مظلومیت پر کوئی نہ رویا ——— بیٹھے ہیں تو اٹھ نہیں سکتے اور اٹھے ہیں تو بیٹھ نہیں سکتے ——— بس میں سوار ہیں، بھیڑ بھاڑ ہے، کنڈیکٹر سر پر سوار ہے، یہ ہیں کہ کھڑے ہو رہے ہیں ——— بھائی جلدی پیسے دو ——— جلدی کہاں سے دیں کہ جو کچھ رکھا ہے پیچھے رکھا ہے ——— پہلے کھڑے تو ہو لیں ——— خدارا بتاؤ تو سہی اس میں کیا معقولیت ہے اور یہ کیا تماشا ہے؟ ——— کیا وہ جیب کافی نہ تھی جو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے کرتے میں بنوائی تھی ——— اور پہننے کو کیا پاجامہ یا شلوار ناکافی تھے جو اپنے جسم کو عذاب میں مبتلا کیا ہے؟

کس کس ادا کا ذکر کیا جائے ——— سگریٹ ہی کو لیجئے ——— بچہ اور بوڑھا سب منہ میں لگائے ہیں ——— اسٹیم انجن بنے ہوئے ہیں ——— دھواں چھوڑ رہے ہیں ——— خود پریشان ہیں اور دوسروں کو پریشان کر رہے ہیں ——— کوئی فائدہ نہیں، نقصان ہی نقصان ہے ——— اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ کی تفسیر بنے ہوئے ہیں ——— اور تو اور کھانے کو میسر نہیں، کش پہ کش لگا رہے ہیں، صحت گنوا رہے ہیں ——— دم میں دم جب تک ہے، لگی چھٹ نہیں سکتی ——— انا للہ وانا الیہ راجعون ——— للہ بتاؤ کہ اس میں کیا معقولیت ہے؟

اور سنئے! ڈرائنگ روم سجا ہے گویا نمائش لگی ہے ——— ہزاروں کے

قالین بچھے ہیں، اسینکڑوں کے صوفے رکھے ہیں اور جیبیوں کے جوتے قالینوں کو پامال کر رہے ہیں اور صوفوں پر بیٹھے ہیں، اسبحان اللہ! ——— کیا بیٹھنے کو زمین کافی نہ تھی اور چلنے کو پیر کافی نہ تھے، جو جوتوں کی ضرورت پیش آئی ——— خدارا بتاؤ کہ فرش و فروش کو جوتوں سے روندنے میں کیا معقولیت ہے! ——— تم معقولیت سے نامعقولیت کی طرف آئے اور تمہیں احساس تک نہ ہوا ——— ماضی کی طرف لوٹو اور ذرا دیکھو کہ تمہارے بزرگ کیا کیا کرتے تھے ——— یہ رجعت پسندی نہیں، یہ عقل پرستی ہے۔

چاندنیاں بچھی ہیں، قالین سجے ہیں، گاؤ تکیے لگے ہیں ——— جوتیاں ایک طرف رکھی ہیں ——— سب ادب سے بیٹھے ہیں جیسے انسان بیٹھتے ہیں ——— مساوات کا سماں ہے ——— سب برابر بیٹھے ہیں، سب ساتھ ساتھ بیٹھے ہیں ——— یہ نہیں کہ کرسی صدارت اُس کے لئے، صوفے اُن کے لئے، کرسیاں تمہارے لئے، کچھ زمین پر بیٹھے ہیں اور کچھ کھڑے ہیں ——— ایک زمین پر سب تماشا ہو رہا ہے لیکن کوئی کہنے والا نہیں کہ نوعِ انسانی پر یہ کیا ظلم ہو رہا ہے ——— آدم خاکی کو کیوں رسوا و ذلیل کیا جا رہا ہے ——— اللہ اللہ! جو معقول تھے، نامعقول کہلائے ——— اور جو نامعقول تھے، معقول کہلائے جانے لگے۔

اے جوانو! اور ہاں اے ملتِ مُسلمہ کی بہارو! تم کو کیا ہو گیا کہ مغلوبِ خزاں ہو گئے ——— اُٹھو اور ایک نعرۂ مستانہ سے سوئی ہوئی بہاروں کو جگا دو۔

حادثات و تجربات

حادثات ثمراتِ حیات ہیں ——— ہر حادثہ جسم و جاں کی پرورش کرتا ہے ——— حادثہ آنی اور وقتی ہے مگر پرورشِ جاں دوامی ——— وہ جان جو حادثات کے آغوش میں نہیں پلی، ناپختہ ہے اور جو حادثات سے گذری ہے اس کی تابناکی نہ پوچھو ——— بات سمجھ میں نہیں آتی تو سینۂ گیتی سے لالہ و گل کا کھلنا دیکھو ——— دہکتی آگ سے کندن کا نکھرنا دیکھو ——— پتھروں کی پامالی سے

نگینوں کا ابھرنا دیکھو ——— بادِ سموم میں غنچے کا سنورنا دیکھو ——— شعاعِ آفتاب سے پھلوں کا پکنا دیکھو۔

باہر نکل کر نہیں دیکھ سکتے، گھر ہی میں دیکھو ——— چولہے میں آگ دہک رہی ہے ——— مزے مزے کے کھانے پک رہے ہیں ——— اس کشاکش سے نہ گزرے تو کھانے میں لطف آ ہی نہیں سکتا ——— اور ہاں اب آگ نہیں ——— حادثہ گزر چکا مگر لذیذ کھانے موجود ہیں اور جسم و جاں بنا رہے ہیں ——— بیشک حادثات زندگی سنوارتے ہیں اور زندگی کو جلا دیتے ہیں ——— معمولی سے معمولی حادثہ بھی دور رس اثرات و نتائج رکھتا ہے، اسی لئے کسی حادثے سے منہ نہ پھیرنا چاہئے بلکہ ہر حادثے سے مستفیض و مستفید ہونا چاہئے ——— یہ بڑی اولوالعزمی کی بات ہے لیکن اکثر لوگ یہ عزم و حوصلہ نہیں رکھتے۔

اماں چڑھاؤ طفلی و شیر خوارگی، نوعمری و نوجوانی، پختگی اور پھر خستگی ——— اللہ اللہ کیسی کیسی منزلیں ہیں ——— لڑکھڑاتا ہے، چلتا ہے، دوڑتا ہے اور پھر ایک ایک قدم پہاڑ ہو جاتا ہے ——— لڑکھڑانے لگتا ہے، جہاں سے چلا تھا، پھر وہیں آ جاتا ہے ——— انسان کا آغاز دیکھو اور پھر اس کا انجام دیکھو ——— دیدنی بھی ہے اور گفتنی بھی ——— انسان؟ انسان نہیں، عروج و زوال کی ایک داستان ہے ——— کیسی عبرت انگیز، کیسی سبق آموز!

شبستانِ شکمِ مادر سے قدم باہر نکالا ——— سب نے بڑی چاہت سے لپکا ——— بڑے چاؤ سے گود میں لیا ——— بڑی شفقت سے گلے لگایا ——— بڑے لاڈ سے پالا ——— چوٹ نہ لگ جائے ——— دل نہ دکھ جائے ——— سردی نہ لگ جائے ——— کانٹا نہ چبھ جائے ——— بھوکا تو نہیں ہے؟ ——— پیاسا تو نہیں ہے؟ ——— اُداس کیوں ہے؟ ——— ہنستا کیوں نہیں؟ ———

روکیوں رہا ہے ـــــ اِک اک بات کا خیال اور اِک اِک ادا پر جان نچھاور۔

شیر خوارگی سے آگے بڑھے، طفلی میں قدم رکھا ـــــ بولنا سیکھا ـــــ چلنا سیکھا ـــــ لکھنا پڑھنا بھی سکھاؤ ـــــ مدرسے میں بٹھاؤ ـــــ بٹھادیئے گئے ـــــ پڑھ رہے ہیں ـــــ بے فکری میں فکر کی چاشنی مل رہی ہے ـــــ کتابیں سامنے ہیں اور جان کھیل میں اٹکی ہے ـــــ کبھی کبھی دل اکتا جاتا ہے لیکن پھر بھی لگے ہیں کہ ذرا ہٹے، پھر بٹھادیئے گئے ـــــ اب وہ اگلا سا پیار نہیں، اب وہ پہلا سا دُلار نہیں ؎

ہائے کیا ہوگیا زمانے کو؟

ہاں اب نوعمری کا زمانہ آیا، فکر نے پیچھا کیا ـــــ مگر کچھ دور دور، پرے پرے ـــــ قریب نہیں آیا ـــــ اور بہت سوں کے قریب بھی آگیا ـــــ اس عمر میں خدا کسی کے قریب نہ لائے ـــــ پڑھ رہے ہیں، بڑھ رہے ہیں ـــــ جوانی قریب آرہی ہے، زندگی میں انقلاب آرہا ہے ـــــ آرزوؤں کا جلوس نکلنے والا ہے ـــــ راستہ صاف ہو رہا ہے ـــــ انسان خود تماشا ہے اور تماشائی بنا ہوا ہے ـــــ افکار کی بارش ہو رہی ہے، آلام کے سائے منڈلا رہے ہیں ـــــ مگر پھر بھی چلتے چلے جا رہے ہیں کہ رک نہیں سکتے ـــــ تاریکیوں میں دیئے جلا رہے ہیں۔

یہ زمانہ بھی گزر گیا ـــــ ایک نیا زمانہ آرہا ہے ـــــ ایک نیا انقلاب آرہا ہے ـــــ زندگی پختہ ہو رہی ہے ـــــ دماغ روشن ہو رہا ہے ـــــ آنکھیں کھل رہی ہیں ـــــ دل مچل رہا ہے ـــــ سنبھل سنبھل کر قدم بڑھا رہے ہیں کہ جو چوکا مار اگیا ـــــ جو چیز ہے اپنی طرف کھینچ رہی ہے ـــــ جذب و کشش کا عجیب عالم ہے!

اور یہ دَور بھی گزر گیا ——— فرازِ کوہ سے نشیب کی طرف آ رہے ہیں ———
جذب و کشش کا وہ عالم نہیں رہا ——— جس کو دیکھ دیکھ کر لپکتے تھے، اب دیکھتے ہیں تو
وہ لپک نہیں، وہ کشش نہیں ——— نظر آگے بڑھ رہی ہے ——— تجربات آنکھیں
کھول رہے ہیں ——— حادثات چونکا رہے ہیں ——— احساسات جگا رہے ہیں
——— حقیقت، مجاز معلوم ہو رہی ہے ——— زندگی فسانہ بن رہی ہے ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا!

اور اب خستگی کا زمانہ آگیا ہے ——— ہر منزل پر دل کی سحر کاریوں، نگاہ کی جادو
طرازیوں نے اپنا اپنا رنگ دکھایا مگر اس منزل پر پہنچ کر رنگ اتنا بدلا بدلا سا معلوم ہوتا ہے
کہ وہ دل، دل اور وہ نظر، نظر نہیں رہتی ——— آہ! حسن کی جادو طرازیوں کو کون چھین
لے گیا؟ ——— نگاہ کی سحر کاریوں کو کس کی نظر لگ گئی؟ ——— آبادیاں ویرانے
نظر آ رہے ہیں، ویرانے آبادیاں معلوم ہو رہی ہیں ——— یہ کیسا انقلاب آگیا! اللہ
اللہ! ہم کہاں سے چلے تھے اور کہاں پہنچ گئے!

اس کے لئے یا اپنے لئے؟ وہ بے نیاز ہے ——— اس کو کسی چیز کی ضرورت
نہیں ——— ضرورت ہمیں کو ہے ———
پھر نماز کس کے لیے؟ ——— روزہ کس کے لیے؟ ——— زکوٰۃ کس کیلئے؟ ———
جہاد کس کے لیے؟ ——— قربانی کس کے لیے؟ ——— صدقات و خیرات کس کے
لیے؟ ——— بیشک اُس کے لئے ہے مگر وہ تو بے نیاز ہے ——— صمدیت
اُس کی شان ہے ——— وہ ایک ہے اور ایسا ایک جو بے نیاز ہے حالانکہ ایک
ہرگز ہرگز بے نیاز نہیں ہو سکتا ——— مگر اُس کی شان یہی ہے کہ ایک ہوتے ہوئے بھی
بے نیاز ہے۔

غور کیجئے ——— پھر غور کیجئے ——— سارے جہان کے فائدے

انسان ہی کے لئے نظر آئیں گے —— نماز پڑھیں، نہ پڑھیں، اُس کو کیا؟ —— روزہ رکھیں یا نہ رکھیں، اُس کو کیا؟ —— زکوٰۃ دیں یا نہ دیں، اُس کو کیا؟ —— جہاد کریں نہ کریں، اُس کو کیا؟ —— قربانی کریں یا نہ کریں، اُس کو کیا؟ —— تو پھر کس کا فائدہ ہے! —— عقل کہتی ہے کہ سراسر انسان ہی کا فائدہ ہے —— اللہ اللہ! ایسا رحمٰن و رحیم کہ ہمارے لئے، ہمارے فائدے سوچے اور ہم اتنے ظالم کہ اپنے ہاتھوں خود اپنا نقصان کریں! ؏

آنچہ ما کردیم بر خود ہیچ نابینا نہ کرد

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اسلام کی ضرورت نہیں تو ہم یہ کہتے ہیں —— کہ ہمیں اپنے فائدے اور اپنے نفع کی ضرورت نہیں —— ہم دیوانے ہیں —— ہماری عقل پر پردے پڑ گئے ہیں —— ہمیں کچھ نہیں سوجھتا —— ہم اندھے ہو گئے ہیں —— ہمیں تاریکیوں میں رہنے دو —— ہمیں روزِ روشن کی ضرورت نہیں —— ہمیں شبِ تاریک کی ضرورت ہے —— ہمیں وحشی رہنے دو —— ہمیں جنگلوں میں بھٹکنے دو —— ہمیں صحراؤں میں سرگرداں رہنے دو —— ہمیں پہاڑوں سے ٹکریں مار مار کر خود کو ہلاک کرنے دو —— ہمیں چھوڑ دو —— ہمیں چھوڑ دو —— ہم دیوانے ہیں!

اللہ اللہ! دیوانگی سی دیوانگی ہے —— اے انسانو! —— اے گلشنِ عالم کے پھولو! اور ہاں اے نسیمِ سحری کے جھونکو! —— تم کو کیا ہو گیا؟ —— تم نے کیوں بربادی پر کمر باندھی ہے؟ —— تم نے کیوں تباہی کی ٹھانی ہے! —— اٹھو اٹھو کہ اسلام تم کو تمہارے لئے بلا رہا ہے —— دنیا کے خدا محتاج ہیں —— اسلام کا خدا محتاج نہیں، بے نیاز ہے —— ہاں وہ غنی ہے —— تم سے لینے کے لئے نہیں —— تم کو دینے کے لئے بلا رہا ہے ؎

مژدہ اے دل کہ بہرِ استقبال
رحمتش بے قرار می آید

خالی ہاتھ انسان دنیا میں آتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے ——— خالی ہاتھ آتا ہے، خالی ہاتھ جاتا ہے ——— مجبور آتا ہے، مجبور جاتا ہے ——— روتا آتا ہے، روتا جاتا ہے ——— لیکن آنے جانے سے بے خبر دنیا کی دلفریبیوں میں مدہوش ہو جاتا ہے ——— دونوں ہاتھوں سے سمیٹتا ہے اور ساری عمر سمیٹتا رہتا ہے ——— پھر بھی ہاتھ خالی کے خالی ——— اس کو نہیں معلوم کہ آن کی آن میں آرزوئیں اور تمنائیں خاک میں مل کر رہ جائیں گی ——— آرام و آسائش خواب و خیال بن کر رہ جائے گا۔

ایک دست بریدہ انسان جہانگیر کے سامنے پیش کیا گیا۔ دریافت کیا:

"یہ ہاتھ کس حادثے میں جاتا رہا ——— کیا جہاد کیا تھا؟"

عرض کیا:

"نہیں جہاد تو نہیں کیا، ایک حادثہ کی نذر ہو گیا۔ بحری جہاز میں اپنے باپ اور بھائی کے ساتھ جاتا تھا کہ ایک جزیرے سے جہاز گزرا، نصرانی قزاقوں نے حملہ کر کے جہاز پر قبضہ کر لیا اور ہم کو پکڑ کر لے گئے ——— پہلے تینوں کو ایک جگہ رکھا پھر بھائی پر کچھ ایسا جادو کیا کہ وہ ان کے ساتھ ہو لیا ——— پھر کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں گیا۔"

"بہت پوچھا، کچھ نہ بتایا ——— آخر معلوم ہوا کہ وہ جزیرے کے شاہی خزانے پر مامور ہے ——— ایک قزاق ہم کو ساتھ لے کر وہاں گیا ——— کیا دیکھتے ہیں بھائی ننگی تلوار لے خزانے کے دروازے پر کھڑا ہے ——— گم سم جیسے پتھر کا مجسمہ ہو ——— وہ قزاق ہم کو خزانے کے اندر لے گیا ——— کیا دیکھتے ہیں کہ ہر سمت سونے چاندی لعل و گوہر اور ہیرے جواہرات کے ڈھیر لگے ہیں ——— اس قزاق نے کہا اس خزانے سے جو کچھ لینا چاہو لے لو ——— ہم دونوں باپ بیٹوں نے دونوں ہاتھوں سے

ہیرے جواہرات سمیٹ کر اپنی جھولیاں بھرنی شروع کیں ——— جب بھری جھولیوں کے ساتھ باہر نکلے تو دروازے سے چند قدم آگے بڑھے تھے کہ اچانک وہ بھائی ایک زبردست جتھے کے ساتھ ہم پر حملہ آور ہوا ——— اس حملے میں میرا ہاتھ کٹ گیا، زر و جواہر بکھر گئے اور ہم مایوس و نامراد لوٹے۔"

غور کرو، انسان کا بھی یہی حال ہے ——— اس معمورِ خزانے میں آتا ہے اور یہاں باپ بیٹوں کی طرح دونوں دونوں ہاتھوں سے سمیٹتا ہے اور سمیٹ کر چلتا ہے تو اچانک موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے ——— اور ساری آرزوئیں اور تمنائیں خاک میں مل کر رہ جاتی ہیں ——— پھر وہی جو اس کے اپنے لختِ جگر تھے، بانٹ بونٹ کر کھا جاتے ہیں۔

پندارِ علم

سفر کرتے کرتے علم کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا ——— عقلِ انسانی حیران ہے، کیا حاصل کرے اور کیا حاصل نہ کرے ——— عمر کوتاہ اور آرزوئیں بے شمار ——— اپنی سی کوشش کر کے کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتا ہے ——— لیکن جو کچھ حاصل کر لیتا ہے، وہ اس معلوم ذخیرۂ علم کے آگے ایک قطرہ بھی تو نہیں جس کو ابھی حاصل نہیں کیا ——— اور اس بحرِ ناپیدا کنار کا کنارہ ہی کیا جو علمِ الٰہی اور علمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے۔

لیکن جب کائناتِ ارضی و سماوی کی وسعتیں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور انسان کتابوں میں گم ہو جاتا ہے تو انسان کو وہی تھوڑا بہت کچھ نظر آنے لگتا ہے اور اس کو بحرِ بیکراں سمجھنے لگتا ہے ——— اکڑتا ہے، اتراتا ہے اور پھولا نہیں سماتا حالانکہ اگر وہ کسی بڑے کتب خانے میں جا کر ایک ایک الماری کو چھانے اور فنونِ جدیدہ اور علومِ قدیمہ کی ایک ایک کتاب دیکھے تو حیران رہ جائے اور پندارِ علم و فضل خاک میں مل کر رہ جائے ——— اور بے ساختہ دل پکار اٹھے کہ حیف ہم نے کچھ بھی تو حاصل نہیں کیا ——— بے شک یہ جاننے کے لئے کہ ہم کچھ نہیں جانتے، بہت کچھ جاننے کی ضرورت ہے

——— مقامِ جہل پر عرفانِ حقیقی حاصل ہوتا ہے۔

یہ تو تحصیلِ علم کی بات تھی ——— مقصدِ علم کی بات ہونی چاہئے، جو کچھ حاصل کیا ہے

——— بیکار تو نہیں ——— بے فائدہ تو نہیں؟ ——— الفاظ کا الٹ پھیر تو نہیں؟

——— حیرت کا گورکھ دھندا تو نہیں؟ ——— تشکیک کا گھروندہ تو نہیں؟ ———

——— جب موت سر پر منڈلانے لگتی ہے اور علم کی دھوپ چھٹ جاتی ہے ———

کھرا اور کھوٹا نظر آنے لگتا ہے ——— پھر وہ موٹی موٹی کتابیں اور وہ مشکل مسئلے

خواب و خیال بن کر رہ جاتے ہیں اور انسان چیخ اٹھتا ہے ؎

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

ڈاکٹر اقبال اپنے عہد کے عظیم فلسفی تھے ——— عمر کا بیشتر حصہ فلسفہ کی

نذر کیا ——— لیکن آخر سمجھ میں آیا تو یہی کہ یہ سب بے سود ہے، یہ سب بے فائدہ ہے

——— بس قرآن و حدیث سینے سے لگانے اور دل میں رکھنے کے قابل ہیں ———

اور سنیئے، انیسویں صدی عیسوی کے مردِ جلیل مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے

سب کچھ حاصل کیا ——— لیکن بالآخر سب کچھ چھوڑ دیا ——— بس قرآن و حدیث کو

سینے سے لگایا ——— فلسفہ و منطق میں کھو کر، ذاتِ باری میں موشگافیاں اور جنابِ

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں گستاخیاں نہ کیں ——— قرآن فہمی کے لئے منطق و

فلسفہ کی نہیں، دانشِ نورانی کی ضرورت ہے اور یہ محض عطائے ربانی سے حاصل ہوتی ہے

——— صحابۂ کرام فلسفی و منطقی نہ تھے ——— فیض یافتۂ مصطفٰے تھے (صلی اللہ علیہ

وسلم) ——— کون کہہ سکتا ہے کہ انہوں نے قرآن و حدیث صحیح نہ سمجھا، ہم صحیح سمجھتے ہیں

کہ فلسفہ و منطق میں طاق ہیں (نعوذ باللہ!) ——— ہرگز نہیں ؏

یہ در دھطا جب ہوتا ہے جب خاص عنایت ہوتی ہے

رنگ برنگ رنگ برنگ ماحول سے لطف اٹھانے کے لئے اُس رحیم و کریم نے رنگ برنگ کی قوتیں عطا فرمائیں ——— آنکھ دی، دیکھنے کے لئے کائنات دی ——— کان دیئے، سننے کے لئے ہزار عنادل نغمہ خواں دیئے ——— ناک دی، سونگھنے کے لئے گلہائے رنگارنگ دیئے ——— زبان دی، چکھنے کے لئے قسما قسم کی کھانے پینے کی چیزیں مہیا کیں ——— اور بس کے لئے وہ کچھ دیا جو گفتنی بھی ہے اور ناگفتنی بھی ——— اللہ اللہ کیسا کرم فرمایا! اور کیا کچھ دیا!

قدرت کے آغوش میں رہنے والا انسان کبھی بگڑ نہیں سکتا ——— قدرت ہمارے حواس کی اعتدال کے ساتھ پرورش کرتی ہے اور ایسے کردار کو پروان چڑھاتی ہے جو دیکھنے دکھانے کی چیز ہوتا ہے ——— لیکن افسوس ہم نے قدرت کے اشاروں کو نہ سمجھا ——— آنکھیں بند کرلیں اور بڑے بڑے شہروں کو بسایا، جہاں فتنے پروان چڑھتے ہیں ——— جہاں ایمان پر ڈاکے ڈالے جاتے ہیں ——— جہاں متاعِ عشق و محبت کو لوٹ لیا جاتا ہے ——— اس امینِ عشق و محبت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی لئے بڑے شہر آباد کرنے سے منع فرمایا ——— جب یہ بات شاعرِ مشرق اقبال نے اٹلی کے مسولینی کو سنائی تو وہ پھڑک اٹھا اور کہا کہ بے شک رسولِ کریم نے سچ کہا ———

ایک افکار کی دنیا ہے ——— اور ایک اعمال کی دنیا ہے ——— ان دونوں جہانوں میں ہر مشاہدہ اور ہر کیفیت اپنا ایک خاص اثر رکھتی ہے ——— کبھی کبھی تو قیامت کا اثر دکھاتی ہے ——— ان کیفیات و مشاہدات پر کنٹرول ضروری ہے ——— قدرت نے بھی کنٹرول رکھا ہے ——— وہ نہیں دکھایا جو قیامت میں دکھایا جائے گا ——— وہ نہیں سنایا جو قیامت میں سنایا جائے گا ——— وہ نہیں سونگھایا جو جنت و دوزخ میں سونگھایا جائے گا ——— وہ نہیں چکھایا اور کھلایا جو جنت و دوزخ میں چکھایا اور کھلایا جائے گا ———

یہ سب کچھ ہے لیکن ہم نے کسی بات سے سبق نہ سیکھا ——— وہی کیا جو عقلِ نارسا نے سکھایا ——— وہ نہ کیا جو عشق نے بتایا ——— ذرا غور کیجئے ——— ٹیلیویژن دیکھئے اور ریڈیو سنئے ——— تلاوتِ کلام پاک بھی ہے، ترجمہ و تفسیر بھی ہے ——— فوراً ہی بعد ساز و آواز بھی ہے، رقص و سرود بھی ہے، جھوٹی سچی خبریں بھی ہیں، کھیل کود بھی ہے ——— غرض وہ سب کچھ ہے جس سے ایک سیرت الجھ کر رہ جائے ——— رنگ برنگ پروگرام ——— رنگ برنگ اثرات ———

اسلام نے 'اثر انگیزی' اور 'اثر پذیری' کی اس دنیا کو اچھی طرح سمجھا ہے ——— ہر اس چیز کو منع کیا ہے جو سیرت کو الجھا کر اور مٹا کر رکھ دے ——— اور ہر اس چیز پر زور دیا ہے جو سیرت کو روشن و تابناک بنا دے ———

ظاہر و باطن

ظاہر حسین، باطن حسین تر ——— یہی قدرت کا اصول ہے ——— پھلوں کو دیکھئے، ظاہر حسین ہے مگر باطن حسین تر ——— پہاڑوں کو دیکھئے، اُن کا ظاہر جمال و جلال سے آراستہ ہے لیکن باطن حسن و جمال کی دولت سے مالا مال ——— سمندروں کو دیکھئے، ان کا ظاہر جمیل و حسین مگر باطن جمال و رعنائی سے بھرپور ——— آسمانوں کو دیکھئے، ان کا ظاہر کیسا دلنشین و دل فریب مگر باطن حسین سے حسین تر ——— کائنات کو دیکھئے کتنی حسین ہے لیکن روحِ کائنات حسین تر ———

انسان بھی پیکرِ حسن و جمال ہے ——— لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ——— اس کا ظاہر حسین ہے حسن و جمال صرف خد و خال میں نہیں، صورتِ تخلیق خود حسن و جمال کا ایک عظیم شاہکار ہے ——— اس حسنِ ظاہر کے بعد پھر کس جمال و زیبائی کی ضرورت ہے؟ ——— لیکن ہم نے اس حقیقت کو نہ سمجھا اور سعیِ لاحاصل میں گرفتار ہو گئے ——— اونچے اونچے محلوں، لمبی لمبی کاروں، انمول و گراں بہا کپڑوں کو حسنِ ظاہر کا سامان سمجھا ہے ——— یہ تو فریبِ محض ہے کچھ نہیں ؎ بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ

کیا تم نے نہ دیکھا! ——— حسین و جمیل پھل، اندر سے سڑا ہوا نکلتا ہے تو پھینک دیتے ہیں، اور یہ خیال بھی نہیں کرتے کہ باہر سے کتنا حسین ہے ——— ہم خود حسنِ باطن کے متلاشی ہیں لیکن حسنِ باطن سے خالی ہیں ——— سڑے ہوئے پھلوں کے ساتھ جو ہم سلوک کرتے ہیں، گھن لگی ہوئی قوم کے ساتھ مؤرخ یہی سلوک کرتا ہے۔

ایک وہ تھے جن کے پاس پھٹے پرانے، پیوند لگے کپڑے تھے ——— وہ سمجھتے تھے کہ حسنِ تخلیق کے بعد پھر کسی حسن کی حاجت نہ رہی ——— ان کا باطن اتنا حسین تھا کہ حسنِ آفتاب و ماہتاب بھی اس کے سامنے ہیچ نظر آتا تھا۔

اے فریب خوردہ شاہینو! ——— ظاہری سج دھج پر نہ جاؤ، باطن کی خبر لو ——— آنکھیں بے نور ہو رہی ہیں سینے ویران ہو رہے ہیں ——— دل ڈوب رہے ہیں، پل چلاؤ سب ——— ٹھہرو ٹھہرو! ——— روکو روکو! ——— زندگی کو رائیگاں نہ جانے دو ع

ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

خاک باد و پائندہ باد

جو خاک ہو گیا، وہ زندہ ہو گیا ——— مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا ——— ہاں مرنے سے پہلے مر جاؤ ——— خاک ہونے سے پہلے خاک ہو جاؤ ——— آرزوؤں کو تج دو کہ موت درحقیقت آرزوؤں کی موت ہے ——— ہاں موت کو مٹا نے دو، زندہ ہو جاؤ! ——— چلتے پھرتے اٹھائے جاتے ہیں ——— مگر شہیدوں کی بات کچھ اور ہے ——— وہ جان کھو کر، جان پاتے ہیں ——— وہ زندگی دے کر زندہ ہوتے ہیں ——— وہ خاک میں مل کر گلِ گلزار ہوتے ہیں۔

دیکھو دیکھو! ننھے سے بیج کو دیکھو! خاک میں مل کر کیسے کیسے گل کھلاتا ہے! کیسی آن بان سے ابھرتا ہے اور کیسی شان سے پھلتا پھولتا ہے ——— ان ننھے فنقوں کا یہ عالم ہے تو اس انسان کا کیا عالم ہو گا جس نے خود کو خاک میں ملایا ہو! ———

وہ کیوں نہ ابھرے گا! ——— وہ کیوں نہ پھلے پھولے گا!

ہاں دیکھو وہ تاجدارِ دوعالم ہے لیکن کیسا سادہ مزاج، سادہ گفتار، سادہ رفتار، سادہ لباس ——— وہ خاکسارانِ جہاں کا سردار ہے لیکن خود کیسا خاکسار، کیسا مسکین اور کیسا غریب! ——— وہ مسکینوں کا آسرا ہے، وہ غریبوں کا سہارا ہے ——— اُس نے دنیا میں جو کچھ حاصل کیا، سب کچھ لٹا دیا، پاس کچھ نہ رکھا ——— جس کے غلام آج شاہی محلوں میں رہتے ہیں، اُن کا آقا چھوٹے سے مٹی کے حجرے میں رہتا تھا ——— زمین پر سوتا تھا ——— جسمِ نازنین خاک آلود ہو جایا کرتا تھا ——— لیکن دیکھو دیکھو رفعتیں اس کی بلائیں لے رہی ہیں ——— زندگی قدم چوم رہی ہے ؎

ورفعنا لک ذکرک کا ہے سایہ تجھ پر
بول بالا ہے ترا ذکر ہے اونچا تیرا

وہ زندہ و پائندہ ہے ——— اس کے در سے زندگی مل رہی ہے

ہاں آؤ! اے مغرورانِ جہاں آؤ! نخوت و غرور کو تج دو ——— خاکسار بن جاؤ ——— خاک ہو جاؤ ——— زندگی تمہارا انتظار کر رہی ہے ——— عظمتیں تمہارے استقبال کے لئے کھڑی ہیں ——— رفعتیں تمہاری آمد آمد کا اعلان کر رہی ہے۔

مقصد و بے مقصد

خالقِ کائنات نے کائنات کو بنایا اور ایک ایک ذرّے میں کوئی نہ کوئی تخلیقی حکمت رکھی ——— دانا و بینا بے مقصد چیزیں نہیں بنایا کرتے ——— سنتِ الٰہی پر عمل کرتے ہوئے ہمارا قول و عمل حکمت پر مبنی ہونا چاہیئے ——— ادب میں مقصدیت اور عدمِ مقصدیت پر ایک طویل بحث چھڑی یا چھیڑی گئی ——— مقصدیت کے مخالفین نے فرمایا کہ مقصدیت سے آرٹ کا کیف و سرور ختم ہو جاتا ہے اور آرٹ، آرٹ نہیں رہتا ——— سبحان اللہ! کیسی عجیب بات کہی ——— کیا قرآنِ کریم کا مطالعہ نہیں کیا؟ ——— ادب کا عظیم شاہکار ہے اور کیف و سرور

سے معمور ——— ایسا شاہکار جس نے چودہ سو برس سے تمام انسانوں کو عاجز کر رکھا ہے ——— اور کیا مناظرِ قدرت کو نہ دیکھا؟ ——— ایک ایک منظر فن کا اعلیٰ نمونہ اور کیسا کیف آور اور کیسا دلفریب! لیکن رگِ گل تک میں مقصدیت کارفرما ہے ——— فنکار کا کمال ہی یہ ہے کہ مقصد کو کیف آور بنا دے ——— اتنا باکیف کہ لوگ مبہوت ہو کر اس کے مقصد میں گم ہو جائیں۔

قدرت کے 'اصولِ مقصدیت' سے بہت سوں نے سبق سیکھا لیکن جن کو یہ اصول سکھایا گیا تھا اور یہ گُر بتایا گیا تھا، وہ غافل ہو گئے ——— اپنے معاشرے پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیے اور پھر دیکھیے تو اکثر باتیں بے مقصد نظر آئیں گی ——— تمام شعبہ ہائے زندگی کو چھوڑیے صرف تعلیمی اور ابلاغی شعبوں کو لیجیے اور اپنے دل سے پوچھتے جائیے ——— نصابِ تعلیم کا کیا مقصد ہے؟ ——— ریڈیو اور ٹیلیویژن کے پروگراموں کا کیا مقصد ہے؟ ——— اخبارات اور رسائل حشرات الارض کی طرح کیوں نکل رہے ہیں؟ ——— تصنیف و تالیف کے کیا مقاصد ہیں؟ ——— وغیرہ وغیرہ

انفرادی اور ذاتی مقاصد کے سوا کوئی اجتماعی مقصد نظر نہ آئے گا ——— مستثنیات کی بات الگ ہے ——— بعض چیزیں تو محض بیکار و بے فائدہ نظر آئیں گی ——— بعض چیزوں میں تسکینِ شہوت کے سامان نظر آئیں گے ——— بعض چیزیں لہو و لعب سے زیادہ کچھ نہ معلوم ہوں گی ——— بعض چیزوں میں خود غرضی اور چاپلوسی کی بو محسوس ہو گی ——— اور بعض چیزیں انتشارِ فکر و عمل کی غماز ہوں گی ———

شاید آپ کو یہ سن کر حیرت ہو ——— واشنگٹن میں ایک عظیم لائبریری ہے جہاں ہر ملک سے شائع ہونے والا لٹریچر فراہم کیا جاتا ہے، پھر اس لٹریچر کو ماہرین کی ایک جماعت مطالعہ کرتی اور لٹریچر کے ذریعہ اقوامِ عالم کے قومی مقاصد معلوم کرتی ہے ——— کہاں کہاں طلوعِ سحر کی چمک دمک ہے اور کہاں کہاں غروبِ آفتاب کی تاریکیاں!

——— اس ذہنی پس منظر میں ہر ملک کے لئے سیاسی علاج تجویز کیا جاتا ہے اور اِس طرح عالم کی نظامِ کار ایک ہاتھ میں آجاتی ہے ——— کیا آپ نے سقوط ڈھاکہ سے قبل بی۔ بی۔ سی لندن کی کارگزاریاں نہ دیکھیں ——— ہزاروں میل کے فاصلے سے جب پروگرام کو ایک سمت موڑا تو ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔

جس ملک میں 'مقصدیت' کی افادیت کو نہ سمجھا گیا وہ ملک بہت جلد دوسروں کے زیرِ نگیں ہو جاتا ہے ——— اللہ تعالیٰ ہم کو اس روزِ بد سے بچائے، آمین۔ ——— لیکن اپنی انفرادی اور اجتماعی ترقی کے لئے ہر چیز کو با مقصد بنانا ہوگا اور اُن افراد کو بلا کسی تعصب و تنگ دلی کے آگے لانا ہوگا جو اس مہم میں قوم و ملک کی مدد کر سکیں ——— مسئلہ چند افراد کے پالنے پوسنے کا نہیں، قوم کی تعمیرِ نو کا ہے ——— اور تعمیر میں ہنرمندوں اور فنکاروں کی پوچھ ہوتی ہے، نکموں کی نہیں ——— ایک معمولی عمارت کی تعمیر میں کیسی کیسی احتیاط برتی جاتی ہے تو پھر تعمیرِ ملت میں ذرہ بھر غفلت پوری قوم کو ہلاک کر سکتی ہے ———

مقصدیت سے دو عظیم فائدے ہیں ——— وقت بچ جاتا ہے ——— اور بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے ——— مقصد سامنے نہ ہو تو وقت ضائع ہوتا چلا جاتا ہے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا ——— قوم جس منزل سے گزر رہی ہے اس میں یہ اصول سامنے رکھنا چاہیئے:

"کم سے کم وقت اور کم سے کم پیسوں میں بہت کچھ حاصل ہو جائے"

یہ اصول سامنے رکھیئے اور زندگی کے ہر شعبے میں اصلاح کیجئے ——— اس اصول کی تشریح و تفسیر قرآن کریم و حدیث میں موجود ہے ——— ملک چین نے اصولِ شریعت میں سے صرف چند اصولوں کو سامنے رکھا اور وہ پھل پایا کہ دنیا عش عش کر اٹھی ——— "اپنی مدد آپ کریں گے، کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں گے" ——— "سادہ زندگی بسر کریں گے، روکھا سوکھا کھائیں گے" ——— بظاہر معمولی اصول ہیں لیکن افادیت کے لحاظ سے عظیم ہیں

——— جس قوم کو ہاتھ پھیلانے کی عادت پڑ جائے اور جس کی زندگی میں سادگی کی جگہ تکلف و تعیش لے لے، پھر اس کا اللہ ہی مالک ہے ——— وہ اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہو سکتی بلکہ دوسروں سے اپنے تحفظ کی ضمانت مانگتی ہے اور تحفظ کی ضمانت وہی دے سکتا ہے جس کے قبضۂ قدرت میں ہماری جان ہے ——— موٹی سی بات ہے ——— سمجھنے کی بات ہے ——— دل میں رکھنے کی بات ہے۔

استاد و فنکار ——— استاد ایک وجود بناتا ہے ——— فنکار ایک چیز بناتا ہے ——— بناتے دونوں ہیں لیکن بنانے بنانے میں زمین و آسمان کا فرق ہے ——— شخصیت کی افادیت دائمی ہے ——— چیز کی افادیت عارضی ہے۔

غور کیجئے، اسمبلیوں میں، دفتروں میں، دکانوں میں، ملوں میں، کارخانوں میں، ہواؤں میں، فضاؤں میں، بحر و بر میں استاد کا فیض جاری ہے ——— بہت کم ایسے ملیں گے جو استاد کے فیض سے محروم ہوں گے ——— لیکن معاشرے کے اس حیرت انگیز فرد کو اس طرح بھلا دیا گیا تھا کہ جیسے وہ تھا ہی نہیں ———

خلیفہ ہارون الرشید باں طنطنۂ شاہی اپنے استاد کی دل و جاں سے قدر کرتا تھا اور اس کی خدمت اپنی سعادت سمجھتا تھا ——— امین اور مامون نے باں نازِ شہزادگی اپنے استاد کی جوتیاں اٹھائی ہیں ——— اور دور کیوں جائیے خود ہندوستان میں اکبر بادشاہ نے باں جاہ و جلال اپنے معلم کی جوتیاں سیدھی کی ہیں ——— اور شاہ جہاں نے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کو کئی بار چاندی سے تولایا ہے اور یہ سب ڈھیر اُن کی خدمت میں نذر کر دیا ہے ——— اورنگزیب باں قوت و جبروت دست بستہ اپنے معلمِ روحانی خواجہ سیف الدین کے پیچھے پیچھے چلا کرتا تھا اور یہ عزت و وقار دل سے تھا۔

استاد علم و دانش کا سرچشمہ تھا ——— اس کے پاس سب آتے تھے، وہ کسی کے پاس نہ جاتا تھا ——— وہ کسی کی خوشامد نہ کرتا تھا ——— وہ کسی کے آگے

ہاتھ باندھ کر کھڑا نہ ہوتا تھا ——— اس کو چھوٹے موٹے افسروں کی توقیر و تکریم کے لئے مکلف نہ کیا جاتا تھا ——— وہ افسروں سے بہت اونچا تھا ——— وہ افسروں سے بے نیاز تھا ——— وہ افسروں کا افسر تھا ——— شاہانہ بسر کرتا تھا ——— وہ فقیروں کی طرح اپنی تنخواہ کے لئے جلوس نہ نکالتا تھا ——— اور شکم پروری کے لئے بھوک ہڑتال پر مجبور نہ کیا جاتا تھا ——— اس کے حاکموں کو اس کے احسانِ عظیم کا پورا پورا احساس تھا ——— اس کو اتنا دیا جاتا تھا کہ وہ بے نیاز ہو جاتا تھا ——— ان کو معلوم تھا کہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا ——— دماغ اس نے روشن کئے ——— دل اس نے روشن کئے اور دنیا اس نے جگمگائی ———

اسلامی دور میں استاد کی جو قدر و منزلت کی گئی، کوئی کر کے تو دکھائے ——— ! اس کی خدمات اتنی عالی ہیں کہ اس کو تنخواہ نہیں ملتی تھی کہ تنخواہ ملازم کو دی جاتی ہے اور اپنے محسن کو ملازم بنانا انسانیت و شرافت کی تذلیل ہے ——— ہاں نذر پیش کی جاتی تھی ——— ——— پھر وہ دور آیا کہ استاد غلام بن گئے ——— بعضوں نے غلامی کا جوا اتار پھینکا اور فقیرانہ بسر کی ——— یہ اہل ہمت تھے ——— ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے استاد کے سر سے غلامی اور نکبت کے سائے نہ سمٹے ——— ایک طرف قوم کی احسان فراموشی کا یہ عالم ہے اور دوسری طرف قدر دانی کا یہ عالم کہ فنکار روپوں میں کھیل رہے ہیں ——— بعض تیر رہے ہیں اور بعض غوطے لگا رہے ہیں ——— جو جی میں آ رہا ہے کر رہے ہیں ——— کوئی پرسانِ حال نہیں ———

اے اہلِ وطن! محسنوں کو فراموش نہ کرو ——— وہ جنہوں نے تم کو جینا سکھایا ——— تم بے خبر تھے، تم کو باخبر کیا ——— تم بصارت سے محروم تھے، تم کو بصارت دی ——— تم کو بصیرت دی ——— تم کو خود آشنا کیا ——— تم کو خدا آشنا کیا۔

العوام کالانعام مشہور کہاوت ہے ——— "عوام چوپایوں جیسے ہیں" ——— یہ بات کچھ عجیب سی ہے ——— دل کو نہیں لگتی ——— لیکن دورِ جدید میں عوام کا طرزِ عمل اس کی صداقت پر گواہ ہے ——— چوپائے ہم جنسوں سے محبت کرتے ہیں مگر عوام یہ نہیں کرتے ——— وہ خود غرض نہیں، خود کھاتے ہیں، سب کو کھلاتے ہیں ——— یہ خود غرض ہیں، خود کھاتے ہیں، کسی کو نہیں کھلاتے بلکہ اگر بس چلے تو دوسروں کو بھی کھا جائیں ——— وہ اپنے رہبر کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں ——— یہ ہر ایک کی ٹانگ کھینچتے ہیں۔

چوپائے کسی قانون کے پابند نہیں لیکن پھر بھی کتنے ذمہ دار اور اطاعت شعار ہیں لیکن عوام ساری پابندیوں اور ذمہ داریوں کے باوجود غیر ذمہ دار ہیں ——— بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی ——— کہا تو یہ گیا تھا کہ "عوام چوپایوں کی مانند ہیں" ——— لیکن دورِ جدید کے عوام نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ——— چوپائے پیچھے رہ گئے اور وہ آگے بڑھ گئے ——— انا للہ وانا الیہ راجعون

اے رفیقو! اور اے ساتھیو! ——— تم نے کیا کیا؟ ——— اپنا جائزہ لو ——— اِک اِک ادا کو دیکھو ——— تم تو انسان ہو ——— ہاں انسان! ——— وہی انسان جو مسجودِ ملائک تھا ——— وہی انسان جس نے مہ و پروین پر کمند پھینکی ہے ——— پھر یہ کیا ہوا کہ تم حیوانوں سے بھی گئے گزرے ہو گئے! ——— بڑھو بڑھو اور انسانیت کی لاج رکھ لو!

صورت و سیرت پہلے لوگ سیرتوں پر جان چھڑکتے تھے، اب صورتوں پر مرتے ہیں ——— تلک الایام نداولہا بین الناس ——— نوجوانوں کو دیکھئے، صورت ہی صورت نظر آئے گی ——— شاندار کپڑے ——— پھیلے پھیلے، اونچے اونچے جوتے ——— لمبے لمبے بال ——— بڑی بڑی مونچھیں ——— داڑھی کی ضرورت نہیں کہ سنتِ رسول ہے ——— وہ بھی کریں تو کیا کریں کہ ہر شخص صورت کی طرف

لٹکتا ہے۔ سیرت کس نے دیکھی ہے!۔۔۔۔۔ سب صورتوں میں لگے ہیں اور سیرتیں معدوم ہورہی ہیں۔۔۔۔۔ جسم بے جان ہو چکے ہیں، لاشے پڑے ہیں۔۔۔۔۔ یہ شہرِ خوباں نہیں، شہرِ خموشاں ہے۔۔۔۔۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!۔۔۔۔۔ اللہ اللہ! دل سجیں نہ سجیں گھر ضرور سجیں گے۔۔۔۔۔ شاندار عمارتیں مگر چند سالوں کی مہمان۔۔۔۔۔ سیرتوں کی دنیا صورتوں کی دنیا بن کر رہ گئی اور صورتوں کا حال نہ پوچھئے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

خوف و احترام کیا اچھا اصول ہے۔ خدا سے ڈرتے رہو اور خدا ترس حاکموں کا احترام کرتے رہو۔۔۔۔۔ مگر اس اصول کو بھلا دیا گیا اور بات الٹی ہو گئی۔۔۔۔۔ خدا کا احترام کرتے ہیں اور حاکموں سے ڈرتے ہیں۔ خوف کھاتے اور لرزہ براندام ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ جاہل نہیں، پڑھے لکھے لوگ:

فلاں صاحب تشریف لانے والے ہیں، فلاں مہینے میں، فلاں دن، فلاں وقت، ہشیار، خبردار!۔۔۔۔۔ بھائی تم کیوں شرکِ خفی میں مبتلا ہو رہے ہو، دوسروں کو بھی مشرک بنا رہے ہو۔۔۔۔۔ تم بندگی اور انسانیت کو کیوں رسوا کر رہے ہو؟۔۔۔۔۔ خوابِ غفلت سے جاگو۔۔۔۔۔ فقرِ غیور کی حقیقت سمجھو۔ اپنا حساب کتاب صحیح رکھو اور بس خدا سے ڈرتے رہو۔۔۔۔۔ غیر خواہ کتنا ہی جابر و قاہر اور بدتمیز کیوں نہ ہو اس کا خوف دل میں نہ آنے دو کہ قَلْبُ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ اللّٰہِ۔۔۔۔۔ اس عرش پر کسی گستاخ کو قدم نہ رکھنے دو۔۔۔۔۔ ہاں جس احترام کا وہ مستحق ہے، اس میں کمی نہ کرو کہ حقیقی مساوات یہی ہے۔۔۔۔۔ جس کا جو حق ہے، وہ اس کو ملنا چاہئے۔

تعریف و تنقیص کیسی اچھی نصیحت ہے۔۔۔۔۔ سامنے ایک ایک کا عیب گنادو، پیٹھ پیچھے کچھ نہ کہو۔۔۔۔۔ بڑی جرأت کی بات ہے، بڑے

حوصلے کا کام ہے ـــــ بزدلی یہ ہے کہ سامنے ماشاءاللہ، سبحان اللہ! اور پیٹھ پیچھے لاحول ولا قوۃ۔

چاپلوسی اور خوشامد کے کیسے کیسے طریقے ایجاد کئے ہیں ـــــ سبحان اللہ! ـــــ پہلے شعراء قصیدے لکھتے تھے اب وہ شعراء تو نہیں رہے، نثر میں مدح و ثنا کی جاتی ہے ـــــ رائی کا پہاڑ بنایا جاتا ہے ـــــ ظالم کو مظلوم اور مردود کو محبوب دکھایا جاتا ہے ـــــ ہر وہ تعریف کی جاتی ہے جس سے اس کی سیرت بیگانہ ہے ـــــ یہ سب کچھ ایک حرفِ مدعا کے لئے ہوتا ہے جو کبھی ظاہر ہوتا ہے اور کبھی پوشیدہ ـــــ قربان جائیے اس رسولِ صادق و امین کے جس نے فرمایا کہ اگر کوئی تمہارے سامنے تمہاری تعریف کرے تو اس کے منہ پر خاک ڈال دو۔ اللہ اللہ! کہاں صداقت و شجاعت کا یہ سبق اور کہاں بزدلی اور کذب بیانی کے یہ مشغلے!

اہتمامِ لفظ ایک 'لفظ' کے ظہور و وجود میں کتنے معاونین کی ضرورت ہوتی ہے ـــــ ذرا غور تو کریں: ـــــ دل، دماغ، چشم، دست، قرطاس، قلم، روشنائی ـــــ اور لوحِ قلم کے پیچھے ـــــ ظہور سے پہلے وجود تک ایک طویل عمل ہے ـــــ اور پھر وجود سے ظہور تک ایک طویل راہ ہے ـــــ ان مسافتوں سے گزر کر 'لفظ' ہمارے سامنے آتا ہے ـــــ وہ ہمارے افکار و خیالات کا دھندلا سا عکس ہوتا ہے ـــــ دھندلا سا اس لئے کہ جو ہم کہتے ہیں کہہ نہیں پاتا۔

ایک لفظ 'محبت' ہی پر غور کیجئے، اس کے معنی سب کو معلوم ہیں لیکن ذرا اس کے تار چھیڑو تو دیکھئے ـــــ نسبتوں سے عجیب انقلاب آجاتا ہے ـــــ جس کو ہم محسوس کر سکتے ہیں، بتا نہیں سکتے کہ دل کی زبان الگ اور زبان کی زبان الگ ـــــ یہ وہ راز ہے جو اہلِ زبان ہی سمجھ سکتے ہیں۔

مال و دولت کی محبت ـــــ ملک و ملت کی محبت ـــــ دوستوں کی

محبت ——— عزیزوں، رشتہ داروں کی محبت ——— بہن بھائیوں کی محبت ——— والدین کی محبت ——— اولاد کی محبت ——— پیر و مرشد کی محبت اولیاء اللہ کی محبت ——— رحمۃ للعالمین کی محبت ——— رب العالمین کی محبت۔

ہر جگہ لفظِ 'محبت' ہے لیکن نسبتوں سے اس کے معنیٰ میں زمین و آسمان کا فرق آگیا ہے ——— ہر جگہ ایک لفظ ضرور ہے، ایک معنیٰ نہیں ——— ہم دل کی بات نہیں بتا سکتے، صرف اشارے کرتے ہیں اور انہی اشاروں کو باتوں سے تعبیر کرتے ہیں ——— بات کی بات بہت اونچی ہے ——— اس پر قدرت حاصل ہو جائے تو انسان انسان بن جائے۔

رجعت پسندی یا معقولیت پسندی

معقولیت پسندی کو جدت پسند ——— قدامت پرستی اور رجعت پسندی کا نام دیتے ہیں ——— شاید ان کو نہیں معلوم کہ قدرت خود رجعت پسند ہے اور قدامت پرست بھی ——— جو چاند کل چمکا تھا، آج بھی چمک رہا ہے ——— جو آفتاب کل طلوع ہوا تھا، آج بھی طلوع ہو رہا ہے ——— جو بادل کل برسا تھا، آج بھی برس رہا ہے ——— جو کلی کل کھلی تھی، آج بھی کھل رہی ہے ——— جو بادِ بہاری کل چلی تھی، آج بھی چل رہی ہے ——— جو دریا کل رواں ہوا تھا، آج بھی روانی پر ہے۔

اے جدت پسندو! تم فطرت سے کیوں نہیں پوچھتے کہ تجھ کو کیا ہوا؟ جو کل ہوا تھا، آج کیوں ہو رہا ہے؟

جدت پسندی اچھی بات ہوتی تو قدرت اپنے اصولوں کو توڑ توڑ کر نئے نئے اصول وضع کرتی اور روز نئے نئے کرتب دکھاتی ——— لیکن جو کچھ دکھایا جا رہا ہے، ایک ازلی اصول و ضابطہ کے تحت ——— یہ رجعت پسندی نہیں، معقولیت پسندی ہے ——— اور جب قدرت جدت پسند ہو گی تو نہ پوچھو کیا ہو گا ——— چاند

ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا ——— پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے ——— اور وہ کچھ ہوگا جو انسان کے خواب و خیال میں بھی نہیں۔

اے جدت پسندو! پھونک پھونک کر قدم رکھو، کہیں قیامت نہ آجائے ——— تمہاری جدت پسندی سے بڑے شہروں میں قیامت اٹھی ہے ——— عقل و خرد سے کام لو ——— قدرت کے اشاروں کو سمجھو اور اس کے حکم سے سرتابی نہ کرو! ——— بات جدت پسندی و قدامت پرستی کی نہیں ——— بات معقولیت پسندی کی ہے ——— بات افادیت و انتفاعیت کی ہے ——— بات بننے اور سنورنے کی ہے ——— جو بات فطرت کے ازلی اصولوں کے خلاف ہو ——— جو بات خدا اور رسول خدا کے خلاف بغاوت و سرکشی ہو، ہرگز ہرگز معقول نہیں اور جو معقول نہیں وہ کتنی ہی جدید کیوں نہ ہو، مردود ہے ——— ٹھکرا دینے کے لائق ہے ——— عقل بھی یہی کہتی ہے اور دل بھی یہی کہتا ہے۔

دِل کیسی مبارک گھڑی ہوگی جب دل نے یہاں قدم رکھا ——— اجنبی اجنبی، حیران حیران، پریشان پریشان ——— کبھی ابھرتے آفتاب کی طرف لپکا گردہ تو غروب ہونے لگا ——— کبھی بڑھتے ماہتاب کی طرف لپکا گردہ تو گھٹنے لگا ——— کبھی گھنگور گھٹاؤں کی طرف لپکا گردہ تو چھٹنے لگیں ——— کبھی مہکتے پھولوں کی طرف لپکا گردہ تو مرجھا مرجھا کر بکھرنے لگے ——— کبھی مال و دولت کی طرف لپکا ——— کبھی بیوی بچوں کی طرف لپکا ——— کبھی رنگ و نسل کی طرف لپکا ——— کبھی تہذیب و تمدن کی طرف لپکا ——— کبھی ملک و ملت کی طرف لپکا۔

ننھا سا دل ——— سرگرداں، پریشاں، حیراں ——— قدرت کو ترس آیا ——— رہبری کے لئے رہبروں کو بھیجا ——— انہوں نے اس وحشی کو پکارا، چمکارا اور پھر دھیرے دھیرے راہ پر لگا دیا ——— انہوں نے بتایا دل لگانے کے قابل

وہی ہے جس نے دل کو بنایا، جس نے سب کچھ بنایا ——— سب کچھ دکھایا ——— سب کچھ سنایا ——— سب کچھ سجایا ——— سب کچھ چکھایا ——— چشم و گوش اور عقل و دل سب ہی کو نوازا ——— وہ کیسا رحیم ہے ——— وہ کیسا کریم ہے! کسی کو محروم نہ رکھا۔

ہاں اے دل والو! دل لگاؤ کہ یہ لگانے کی چیز ہے ——— بیکار نہ رہنے دو کہ بیکار رہا تو پھر دل کہاں رہا! ؎

دل مردہ، دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

یہ ذرّے! ذرّے اڑ رہے ہیں ——— ہاں اڑ رہے ہیں ——— چمک رہے ہیں ——— بکھر رہے ہیں ——— رواں دواں ہیں ——— کون ہیں؟ ——— کہاں سے آئے ہیں؟ ——— کہاں جا رہے ہیں؟ ——— کیوں پریشان ہیں؟ ——— کس کی تلاش میں سرگرداں ہیں؟

دیکھو یہ عمارت کتنی شاندار تھی ——— یہاں کیسی چہل پہل تھی ——— اس کو کس کی نظر کھا گئی؟ ——— یہ خاک میں کیوں مل گئی؟ ——— کہیں یہ ذرّے اس کا فسانۂ غم تو نہیں سنا رہے؟ ——— ہاں سنو سنو! ذرّوں کی زبان بن کر یہ عمارت کیا کہہ رہی ہے؟ ———

دیکھو وہ جوان کتنا حسین و رعنا تھا ——— اس پر ہر ایک کا دل لوٹے جاتا تھا، اب وہ بوڑھا ہو چکا ہے ——— اب اس میں وہ کشش نہ رہی ——— ہاں دیکھو دیکھو اس کی میت جا رہی ہے ——— اب وہ خاک میں ملا جا رہا ہے ——— کہیں یہ ذرّے اس کے جسمِ ناتواں کے سہارے تو نہیں؟ ——— کہیں یہ ذرّے خانۂ حسن و جمال تو نہیں؟

دیکھو یہ بیل بوٹے کیسے خوبصورت تھے ——— ایک ایک پھول رشکِ صد جنت تھا ——— خزاں کیا آئی سب کو خاک میں ملا کر رکھ دیا ——— کہیں یہ

یہ ذرے ان پھولوں کی داستانِ خونچکاں تو نہیں؟

دیکھو وہ بلبلِ ہزار داستان ابھی ابھی چہچہا رہا تھا ——— تن بدن سے مسرتیں پھوٹ رہی تھیں ——— لیکن اب اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا ——— کہیں یہ ذرے ایک نغمۂ خاموش تو نہیں؟

اللہ اللہ! ایک ایک ذرہ امینِ راز ہے ——— کسی محل کی رونق ہے ——— کسی جواں کی رعنائی ہے ——— کسی درخت کی بہار ہے ——— کسی پرند کا نغمہ ہے ——— کسی دکھی کی پکار ہے ——— انہیں ذروں میں جان پڑی تو محل محل تھے ——— جواں جواں تھے ——— گل گل تھے ——— اللہ اکبر ؎

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہورِ ترکیب
موت کیا ہے؟ انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

ہاں یہ کیا کرشمہ ہے کہ ذرے محلوں کا روپ دھارتے ہیں ——— رعنائیوں میں ڈھل جاتے ہیں ——— نغموں میں گھل مل جاتے ہیں ——— مگر یہ ذرے تو کچھ نہیں ——— پھر یہ سب کچھ کیوں بن جاتے ہیں؟ ؎

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

رفیقۂ حیات

جہاں جاتے ہیں، ساتھ جاتی ہے ——— ایک دم جدا نہیں ہوتی ——— قدم قدم پر جان کے ساتھ لگی ہے ——— کون؟ ؎

وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

"تم کو مٹی سے پیدا کیا اور سارے عالم میں پھیلا دیا" ——— "تم کو مٹی سے پیدا کیا اور مٹی میں لوٹا دیا جائے گا" ——— اور ہاں ——— "اسی مٹی سے پھر اٹھایا جائے گا" ——— اس سے مفر مقدر نہیں۔

یہ خاک ——— ہاں یہ خاک ——— زمین پر پڑی ہے ——— ہوا کے دوش پر اڑ رہی ہے ——— پیروں تلے مچل رہی ہے ——— بڑھ بڑھ کے بلائیں لے رہی ہے ——— کہیں ساتھ نہیں چھوڑتی ——— بڑی وفادار ہے ——— کیسی رفیقۂ حیات ہے! ——— ہم الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں ——— ہم قلعوں میں، محلوں میں، کوٹھیوں میں، بنگلوں میں بچ بچ کر رہتے ہیں ——— مگر وہ الگ تھلگ رہنا جانتی ہی نہیں ——— بڑی ملنسار ہے ——— بڑی کریم ہے ——— بڑی شفیق ہے ——— بڑی مہربان ہے۔

ہاں مٹی سے نفرت کرنے والو! دیکھو دیکھو عالم کا تاجدار مٹی پر بیٹھا ہے ——— دیکھو دیکھو فاروقِ اعظم جس کی ہیبت سے ایک عالم ترساں تھا، اسی مٹی پر لیٹا ہے ——— ہاں مٹی سے پیار کرنا سیکھو کہ لالہ و گل بن کر ابھر سکو ——— لیکن وہ پیار نہیں جس نے جنت کو دوزخ بنا دیا ہے ——— جس نے شکاری انسان کو خود شکار بنایا ہے ——— جس نے غالب کو مغلوب، حاکم کو محکوم اور مختار کو مجبور بنا دیا ہے ——— جس نے رہبر کو رہزن بنا کر عظمتِ پیشوائی کو خاک میں ملا دیا ——— نہیں نہیں ——— یہ پیار نہیں ——— وہ پیار جس نے قلب و نظر کو وسعت بخشی ——— جس نے زمین پر ہونے والے سجدوں کو عرش کی رفعت بخشی ——— جس نے شاہی میں فقیری کی چاشنی ملائی ——— جس نے زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا۔

فریادی نقش ابھر رہے ہیں ——— نقش مٹ رہے ہیں ——— عجب تماشا ہے ——— صنعۂ کائنات کیا ہے، سطحِ چرخِ مینائی ہے جہاں ستارے چمک چمک کر بجھ رہے ہیں ——— یا سطحِ سمندر ہے جہاں حباب دم لے رہے ہیں اور بے دم ہوئے جا رہے ہیں ——— یا صحنِ گلشن ہے جہاں کلیاں چٹک چٹک کر پھول بن رہی ہیں ——— اور پھول کھل کھل کر مرجھا رہے ہیں ——— یا کوئی گلخن ہے جہاں

چنگاریاں اچھل اچھل کر نکل رہی ہیں اور تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہی ہیں ——— یا محفلِ رنداں ہے جہاں خم پہ خم لنڈھائے جا رہے ہیں اور ساغر پہ ساغر چڑھائے جا رہے ہیں ——— ایک ہنگامہ بپا ہے ——— ساغر و سبو ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے ہیں ——— ہاں ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا!
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا!

انقلابِ خاموش

ہر چیز متحرک ہے ——— بظاہر ساکن نظر آتی ہے ——— مگر متحرک ہے ——— نباتات کیا، جمادات کیا! ——— مکانات کیا، محلات کیا! ——— انسان کیا، حیوان کیا! ——— درخت سوکھ کر کیوں ٹھنٹھ ہو گئے؟ ——— پتھر کیوں ریزہ ریزہ ہو گئے؟ ——— مکان کیوں ڈھے گئے؟ ——— محل کیوں ویران ہو گئے! ——— یہ سب کچھ ایک دم تو نہیں ہوا ——— خود ہمارے وجود میں شکست و ریخت کا یہ سلسلہ جاری ہے ——— مگر معلوم نہیں ہوتا ——— ہر عضو اپنی جگہ سالم ہے ——— مگر گھل رہا ہے ——— ہر وقت حرکت میں ہے ——— ہم کو احساس تک نہیں ہوتا ——— جو آنکھیں دیکھتی تھیں، اب بے نور ہوئی جاتی ہیں ——— جو ہاتھ پکڑتے تھے، اب لرزنے لگے ——— جو پیر چلتے تھے، اب کانپنے لگے ——— جو دماغ سوچتا تھا، اب کھویا کھویا سا رہنے لگا ——— اللہ اللہ! یہ سب کچھ کیا ہو گیا! ——— ہم کو تو کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا! ——— یہ خود بخود کیا ہو گیا؟

گلشن کے گلشن ویران ہو گئے ——— کھیت کے کھیت پامال ہو گئے ——— پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گئے ——— مکانات بے آباد ہو گئے ——— محلات ویران ہو گئے ——— چلتے پھرتے انسان ——— دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو گئے ———

لیکن اس انقلابِ خاموش کو کسی نے اپنی آنکھ سے نہ دیکھا۔

اعجازِ قلم زندگی میں قدم قدم پر وسیلے کی ضرورت ہے ——— بغیر وسیلے کے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے ——— آنکھ نہ ہو، دیکھ نہیں سکتے ——— کان نہ ہو تو سن نہیں سکتے ——— ناک نہ ہو تو سونگھ نہیں سکتے ——— زبان نہ ہو تو چکھ نہیں سکتے اور بول نہیں سکتے ——— ہاتھ نہ ہو تو کوئی چیز پکڑ نہیں سکتے ——— پیر نہ ہوں تو چل نہیں سکتے ——— غرض کہاں تک گنایا جائے! ——— اللہ اکبر! وسیلے نہ ہوں تو ہم معطل ہو کر رہ جائیں ——— وسیلے بغیر گزر نہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ قلم دو تو جو کچھ جاننا چاہیے یا جاننا چاہتے ہو، جان نہیں سکتے ——— خدا نے ہاتھ دیئے، انسان نے ہتھیار اٹھا لئے ——— قرآن نے للکارا ——— اے ہتھیار اٹھانے والے! ذرا قلم تو اٹھا کر دیکھ ——— دیکھ یہ کیسے گل کھلاتا ہے ——— تیرے ہتھیار کی لالی چھٹ سکتی ہے لیکن اس کی لالی نہیں چھٹ سکتی ———

وہ انسان جس کو ہتھیار اٹھاتے شرم نہ آتی تھی، قلم اٹھاتے شرم آتی تھی ——— اس کو قلم پکڑنا سکھایا اور ببانگِ دہل اعلان کر دیا گیا :

عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ

"ہم نے قلم کے وسیلے سے انسان کو وہ کچھ بتا دیا جو وہ نہ جانتا تھا"

یہ اعلان کیا تھا، ایک انقلاب تھا ——— جس نے صور پھونک دیا اور مردہ پیکروں میں جان آگئی ——— کاروانِ علم جس نے نہ معلوم کب سے پڑاؤ ڈال رکھا تھا، بڑھنے لگا ——— اور بڑھتے بڑھتے کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا!

اس قلم نے بہت سے چولے بدلے ہیں ——— اور نئے نئے روپ دھارتے ہیں ——— سینکڑوں راز کھول دیئے ہیں ——— اور کروڑوں بے علموں کو دانائے راز بنا دیا ہے ——— کروڑوں درود و سلام ہوں اس محسنِ انسانیت پر

جس نے یہ راز سربستہ فاش کر کے انسان کو دورِ جاہلیت سے نکال کر فضیلت و علمیت کا اجالا دکھایا۔

ضد و ہٹ دھرمی وہ نیچے بیٹھتے تھے، ہم اوپر بیٹھیں گے ——— وہ پیدل چلتے تھے، ہم سواریوں میں چلیں گے ——— وہ جھک کر ملتے تھے، ہم اکڑ کر ملیں گے ——— وہ آہستہ چلتے تھے، ہم دوڑ کر چلیں گے ——— وہ غریبوں سے ملتے تھے، ہم صرف امیروں سے ملیں گے ——— وہ نیازمندی سے ملتے تھے، ہم بے نیازی سے ملیں گے ——— وہ چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے، ہم خود پر شفقت کریں گے ——— وہ دوسروں کے لئے کیا کرتے تھے، ہم اپنے لئے کریں گے ——— وہ مفت پڑھاتے تھے، ہم پیسے لے کر اور رچا رچا کر پڑھائیں گے ——— وہ سب کے کام آتے تھے، ہم کسی کے کام نہ آئیں گے ——— وہ پڑوسیوں کا حق جانتے تھے، ہم پڑوسیوں کو نہیں جانتے ———

وہ ڈاڑھی رکھتے تھے، ہم صرف مونچھیں رکھیں گے ——— وہ بال منڈواتے تھے، ہم بالوں کا جنگل رکھیں گے ——— اور بڑھاتے بڑھاتے ڈاڑھی کی سرحدوں میں داخل کر دیں گے مگر واللہ باللہ ڈاڑھی نہ رکھیں گے ———

وہ سیدھے سادے کرتے پہنتے تھے، ہم رنگ برنگ قمیصیں اور نہ معلوم کیا کیا پہنیں گے ——— وہ شلوار اور پاجامہ پہنتے تھے، ہم پتلونیں اڑا کر ارتھی بنیں گے اور نیکر پہن کر عریاں ہوں گے ———

وہ ہلکے سے دروازہ بند کرتے تھے، ہم زور سے بند کریں گے ——— وہ آہستہ بیٹھتے تھے، ہم زور سے بیٹھیں گے ——— وہ کفایت سے خرچ کرتے تھے، ہم بے دریغ خرچ کریں گے ——— وہ مستقبل کی فکر میں رہتے تھے، ہم مستقبل سے بے نیاز رہیں گے ——— وہ قرآن شریف پڑھتے تھے، ہم افسانہ و ناول پڑھیں

گے ـــــ وہ نعتیں سنتے تھے، ہم صرف فلمی گانے سنیں گے ـــــ وہ خدا کے جلوے دیکھتے تھے، ہم ٹی وی کے جلوے دیکھیں گے ـــــ

اللہ اللہ! ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے! ـــــ ضد و ہٹ دھرمی کا یہ عالم کہیں نہ دیکھا ـــــ اخلاف کو اپنے اسلاف سے اس طرح لڑتے جھگڑتے نہ دیکھا ـــــ اے جوانو! ـــــ اے ماضی کی بہارو اور مستقبل کے سہارو! ـــــ اپنے بزرگوں سے اس طرح دو رو ٹھو ـــــ ذرا دیکھو تو سہی انہوں نے کیا پایا اور تم نے کیا کھویا! ـــــ متاعِ کارواں لٹ رہی ہے ـــــ ذرا ہمت دکھاؤ اور آگے بڑھو ـــــ رہزنوں اور لٹیروں کی اصلاح کرو ـــــ اور اس روش پر چلو جو سلامتی اور عافیت کے ساتھ تمہیں منزل تک پہنچا دے۔

انسانِ کامل

وہ اپنے حسین و جمیل جواں سال بیٹے کی لاش پر کھڑا ہے ـــــ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں ـــــ ہمت و استقامت کی چمک ہے ـــــ وہ کہہ رہا ہے ـــــ "میرے مولیٰ تیرہ بندہ تیری رضا پر راضی ہے، ہرگز ہرگز مضطرب نہیں" ـــــ

وہ کفار و مشرکین کے نرغے میں پھنسا ہے ـــــ جانثار بھی ساتھ ہیں ـــــ دیکھو ایک سکھ نیام سے تلوار نکال رہا ہے ـــــ اور دیکھو دیکھو اس کا خدا کار اس کو للکار رہا ہے ـــــ اس کے ہاتھ ٹھٹھک کر رہ گئے ـــــ وہ وار نہ کر سکا ـــــ مگر یہ سب کچھ ہوا، وہ کوہِ استقامت خندہ پیشانی سے یہ سب کچھ دیکھا کیا ـــــ اس کے چہرے پر خوف و دہشت کا نام و نشان تک نہ تھا ـــــ وہ اپنے مولیٰ کی یاد میں اتنا مگن تھا کہ دوست و دشمن سے بے نیاز تھا ـــــ

چاروں طرف کشت و خون کا بازار گرم ہے ـــــ بموں کی گھن گرج اور گولیوں کی سنسناہٹ سے کلیجہ منہ کو آرہا ہے ـــــ فضاؤں پر موت کے سائے

منڈلا رہے ہیں ——— مگر وہ گوشۂ مسجد میں اس طرح خدا کی یاد میں مصروف ہے جیسے یہ قیامت ایک خواب و خیال ہے ———

نمازِ عید ہونے والی ہے ——— وزیروں سفیروں کی آمد آمد کی خبر گرم ہے ——— وہ اپنے بیٹے کو ہدایت کر رہا ہے ——— "دیکھنا ان وزیروں، سفیروں کے لئے نماز میں ایک منٹ کی بھی تاخیر نہ کرنا ——— تم اپنے مولیٰ کے سامنے حاضر ہو ——— ہاں حضوری کی لاج رکھنا" ———

وہ نمازِ عصر کے لئے اٹھا ہے ——— ابھی کمرے سے باہر نہیں آیا کہ سامنے سے سکوسٹی مجسٹریٹ زیارت کے لئے حاضر ہو رہا ہے ——— مصافحہ کرتا ہے اور پیچھے ہٹ جاتا ہے ——— مگر یہ اپنے مولیٰ کے لئے اٹھنے والا اس کے لئے ایک لمحہ نہیں رکتا ——— جو قدم مولیٰ کے لئے اٹھ گئے، اب وہ پیچھے نہ ہٹیں گے ——— یہ محرابِ مسجد کی طرف بڑھ رہا ہے ——— اور وہ دروازۂ مسجد کی طرف جا رہا ہے ——— ہاں تم نے جلالِ فقیری نہ دیکھا ہو تو اس محرابِ مسجد کی طرف جانے والے فقیرِ بے گلیم کو دیکھو! ———

وہ نمازِ جمعہ سے فارغ ہو کر دولت کدے کی طرف جا رہا ہے ——— کچھ دور نہ گیا تھا کہ مسجد میں بم پھٹنے کی دل دوز آواز سنتا ہے ——— ہاں وہ مسجد کی طرف لوٹ رہا ہے ——— وہ اپنے زخمی جانثاروں کی تعزیت کر رہا ہے ——— وہ ان کو دلاسا دے رہا ہے ——— وہ موت سے ڈر کر نہیں بھاگا ——— وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا ہے ———

کفار و مشرکین کی نگری میں بیٹھا مسلمان کر رہا ہے ——— آؤ آؤ! تبلیغ کا ڈھنگ اس سے سیکھو ——— اس کی ہمت تو دیکھو ——— اس کی جرأت تو دیکھو ——— وہ بے خوف ہے ——— وہ نڈر ہے ——— سرکار پوچھ رہی ہے

"کیوں مسلمان کہتے ہو؟" ——— اور وہ جواب دیتا ہے ——— "ارے مجھ سے مت پوچھو کہ کیوں مسلمان کہتا ہوں، اس سے پوچھو کہ وہ کیوں آتا ہے" ——— منہ بند ہو گئے ——— زبانیں گنگ ہو گئیں ———

وہ پاکستان آیا ہوا ہے ——— اس کے فدا کار کہہ رہے ہیں کہ یہاں آجائیں ——— ہم پلکوں پر بٹھائیں گے، سینے سے لگائیں گے ——— مگر وہ کہہ رہا ہے ——— "غریب مسلمانوں کو اس فقیر کی ضرورت ہے، ان غریبوں کو کس کے بھروسے پر چھوڑ کر چلا آؤں؟" ———

وہ زیارتِ حرمین کے لئے حاضر ہے ——— شاہِ حجاز اپنے دربار میں بلا رہا ہے ——— اور وہ پیکرِ عزیمت کہہ رہا ہے ——— "جو بندہ شہنشاہِ مطلق کے دربار میں حاضر ہوا ہے اس کو کسی اور دربار میں جانے کی حاجت نہیں" ———

وہ نہیں جاتا ——— وہ سارے عالم سے منہ موڑ کر اپنے ربِ کریم کے در پر حاضر ہے۔

اور دیکھو، والیٔ حیدرآباد دکن بلا رہا ہے ——— شاید کوئی وظیفہ جاری کرنا چاہتا ہے ——— مگر وہ شاہوں کا شاہ اور فقیروں کا فقیر ——— جواب دے رہا ہے ——— "فقیر کو حاجت نہیں، اگر اس کو ضرورت ہے تو فقیر کے غریب خانے پر آجائے" ———

عیدگاہ کا شاہی امام، پاکستان ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ آیا ہے ——— عید بھی آرہی ہے ——— لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ شاید اب کی عید، امامِ عیدگاہ پڑھائیں گے ——— مگر جو عیدگاہ پر قابض ہو چکے تھے صاف جواب دے رہے ہیں اور یہ حیران و ششدر ان کا منہ تک رہا ہے ——— اللہ اللہ! یہ دن بھی دیکھنے تھے ——— جہاں اس کے خاندان نے صدیوں نمازیں پڑھائیں، آج اسی عیدگاہ میں وہ مجبور و بے بس ہے ——— اس کا دل ٹوٹ گیا ——— وہ غم و الم میں ڈوب گیا ——— مگر جب

اس ظلم و ستم کی خبر اس کو ہوئی جو ٹوٹے دلوں کا سہارا تھا تو اس نے اعلان کیا ——— ——— ہم اپنی شاہی مسجد میں اب کے عید کی نماز نہ پڑھائیں گے ——— امام عیدگاہ پڑھائیں گے ——— صدیوں سے اُس کا خاندان امامت کرتا چلا آرہا تھا مگر آج ایک غمزدہ مہمان کے لئے اس نے اس آن کو بھی توڑا ——— اور دکھا دیا کہ ٹوٹے دلوں کو اس طرح سہارا دیا کرتے ہیں ——— ذرا بتاؤ تو سہی کہ اس دورِ قحط الرجال میں کوئی ہے جس نے صبر و استقامت، عزم و ہمت، غمخواری و دردمندی کے یہ چراغ روشن کئے ہوں؟ ———

معلوم ہے وہ عظیم انسان کون تھا؟ ——— وہی جس کو دنیا مفتی اعظم ہند کہہ کر یاد کرتی ہے ——— وہی جس کا نام نامی محمد مظہر اللہ تھا ——— وہی جو شاہی مسجد فتحپوری کا امام و خطیب تھا ——— ہاں وہی ——— آج بھی جس کا مزارِ مبارک اسی مسجد میں زیارت گاہِ خلائق ہے ؎

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

محبت یا نفرت

کہنے والے کہتے ہیں ——— "ہمارے ملک میں ہمارے ہی ملک کا" ——— "ہمارے صوبے میں، ہمارے ہی صوبے کا" ——— "ہمارے شہر میں، ہمارے ہی شہر کا" ——— سبحان اللہ! جو خدا کا ملک تھا وہ ہم اپنا سمجھ بیٹھے ——— مگر جب قلب و نظر پر پردے پڑ جاتے ہیں تو کلِ انسانی اسی طرح گمراہ ہونے لگتی ہے ——— اللہ اللہ! رب العالمین کے ماننے والے اور رحمۃ للعالمین کے متوالے یہ کیسی باتیں کرنے لگے؟ ———

ہاں محبت کی بات کرو ——— وطنیت و صوبائیت کا داعی ہو یا شہریت و علاقائیت کا ——— یہ محبت اس کے بس کی بات نہیں ——— یہ وہ شراب نہیں

جو اس کے تنگ سینے میں سما سکے ——— جب انسانوں سے محبت ہوتی ہے تو ملک ابھرتے ہیں ——— اور جب صوبوں سے محبت ہوتی ہے تو ملک اجڑتے ہیں ——— پاکستان کا بننا دیکھو ——— اور بنگلہ دیش کا اجڑنا دیکھو ———

اے جوانو! ——— اے مستقبل کے روشن مینارو! ——— تم کدھر جا رہے ہو؟ ——— تم کو کدھر لیجایا جا رہا ہے؟ ——— ہاں وہ بستی و سرشاری اور وہ الفت و محبت پیدا کرو کہ تم ایک نئے جہان کی تعمیر کر سکو ———

تضحیکِ محبت

ڈاڑھیاں صاف ہیں ——— مقابلہ حسن قرارت ہو رہا ہے ——— سبحان اللہ! مقابلہ حسن ہے یا مقابلہ حسنِ قرارت؟ ——— ایسی محفلیں تو کبھی نہ دیکھی تھیں ——— یہی نہیں عورت مرد ساتھ ساتھ بیٹھے ہیں ——— ایسی پاک مجلسوں میں یہ اختلاط تو خواب میں بھی نہ دیکھا تھا ——— اللہ اللہ! حقیقت فسانہ بن رہی ہے ——— اور فسانہ حقیقت! ———

سیرت رسول پاک بیان کی جا رہی ہے ——— ذکر شہید وفا ہو رہا ہے ——— صفائی کا خاص اہتمام کر کے آئے ہیں ——— بے شک صفائی کا یہی موزون وقت تھا ——— تقریباً اس زور شور سے فرما رہے ہیں کہ بس عاشقِ رسول ہیں تو یہی ——— عاشقین ہیں تو یہی ——— مگر چہرہ دیکھ دیکھ کر محبت سینہ پیٹ رہی ہے اور عشق دھاڑیں مار رہا ہے ———

نعت پڑھی جا رہی ہے ——— عورت و مرد ساتھ ساتھ ہیں ——— کبھی آمنے سامنے قطار در قطار ——— سبحان اللہ! ماشاء اللہ! ——— ٹی وی پر یہ مناظر بھی دیکھے ——— جو رسول شرم و حیا کا داعی تھا آج اسی کی نعت اس بے حیائی اور ڈھٹائی سے ——— انا للہ وانا الیہ راجعون!

ہم اپنے ایک ایک عمل سے محبت کا مذاق اڑا رہے ہیں ——— قرآن پڑھ رہے

ہوں یا سیرتِ رسول پر تقریر کر رہے ہوں ——— یا نعت پڑھ رہے ہوں ——— جو کچھ بھی کر رہے ہوں ——— معلوم ہوتا ہے کہ خدا اور رسول کا مذاق اڑا رہے ہیں ———

اے محبت کا دم بھرنے والو! ——— اہلِ محبت کی سی صورتیں بناؤ ———

ذرا سوچو تو سہی تم کہاں جا رہے ہو؟ ——— تم کیا کر رہے ہو! ——— آؤ آؤ محبت کے دیئے جلاؤ ——— آؤ آؤ عشق کی لاج رکھ لو ——— آؤ آؤ محمد مصطفےٰ کی ایک ایک ادا پر قربان ہو جاؤ ——— اس کے رنگ میں رنگ جاؤ ——— اس کے ہو جاؤ کہ خدا تمہارا ہو جائے ———

یادیں اور باتیں

نہ معلوم محسنوں کی یاد منانے کی رسم کب سے چلی ہے ——— شاید جب سے بھلانے کی رسم چلی ہے ——— جب یاد رکھا کرتے تھے، یاد کرنے کی ضرورت نہ تھی ——— جب بھولنے لگے تو یادوں کے دن منائے جانے لگے ——— یہ رسم بہت اچھی ہے ——— جاری رہنی چاہیئے ———

لیکن اب بات یہاں تک پہنچی ہے کہ یاد کرتے ہیں مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اہتمام فراموشی ہو رہا ہے ——— اللہ اللہ! یادوں کے اجالوں میں فراموشیوں کے یہ اندھیرے ——— انا للہ وانا الیہ راجعون!

میلاد النبی کی محفل سجی ہے ——— عورت مرد ساتھ ساتھ بیٹھے ہیں ——— جلوس نکل رہا ہے ——— ڈھول بج رہا ہے ——— خرافات کے اس سائے میں اس محسنِ اعظم کی یاد منائی جا رہی ہے جس نے زندگی کو تمام خرافات سے پاک کر دیا تھا ——— عرس کے میلے لگے ہیں ——— مردانِ خدا کی یاد منائی جا رہی ہے ——— نہ فاتحہ کا ہوش ہے اور نہ نماز کا ——— عورت و مرد یک جا ——— طرح طرح کے تماشے ——— طرح طرح کے نظارے ——— رنگ برنگ کے انسان ———

اللہ اللہ! یہ محبوبانِ خدا کی یاد منائی جا رہی ہے!

جو یاد رکھتے ہیں وہ باتیں نہیں کرتے ——— ان کی زندگی سراپا عمل ہوتی ہے ——— لیکن جو یاد کرنا نہیں چاہتے وہ بہت باتیں کرتے ہیں ——— زندگی جب عمل سے عاری ہو جاتی ہے تو زبان کھل جاتی ہے ——— اور عظمتِ اسلاف افسانہ بن جاتی ہے ———

ہاں اے جوانو! اے یادِ ماضی کے سہارو! ——— تم اپنے اسلاف کی خوبیوں سے اپنا تن من سجاؤ ——— تم حقیقت بن کر عالم پر چھا جاؤ! ———

حصار

انسان بندھنوں میں جکڑا ہے ——— اور حصاروں میں گھرا ہے ——— بہت سے بندھن ہیں ——— بہت سے حصار ہیں ——— جب درونِ خانہ نظر جاتی ہے تو بہت سے نفسیاتی حصار دکھائی دیتے ہیں ——— بشری حصار ——— خاندانی حصار ——— نسلی حصار ——— لسانی حصار ——— وطنی حصار ——— فکری حصار ——— اللہ اللہ! کتنے حصاروں میں انسان گھرا ہے! ——— اور کتنے بندھنوں میں جکڑا ہے! ———

اور درونِ خانہ سے نظر پلٹتی ہے تو باہر بہت سے حصار نظر آتے ہیں ——— خانگی حصار ——— شہری حصار ——— صوبائی حصار ——— وطنی حصار ——— کہیں مفر مقر نہیں ——— جائے تو کہاں جائے؟ ———

ان سارے حصاروں سے نکلنا ——— اور ان سارے بندھنوں کو توڑنا بڑی ہمت کی بات ہے ——— اور بڑی اولوالعزمی کا کام ہے ———

جب نگاہ اوپر جاتی ہے ——— تو ناسوتی حصاروں سے ٹکرا کر ——— آفاقی اور ماورائے آفاق نظارے نظر آتے ہیں ——— اور ایک عجیب روح پرور منظر ہوتا ہے ——— سمٹا ہوا وجود پھیلتا ہوا معلوم ہوتا ہے ——— رنگ و نسل کی گھٹائیں چھٹ رہی ہیں ——— زبان و بیان کے نقوش مٹ رہے ہیں ———

ماہ و سال طیورِ آوارہ کی مانند اڑ رہے ہیں ——— فضا کی گرد صاف ہو رہی ہے ———
عرشِ بریں کے نظارے ہو رہے ہیں ——— عجب منظر ہے ——— ہر بلندی پستی معلوم
ہو رہی ہے ———

آزک نیوٹن نے ایک مدت بعد نظریۂ کششِ ثقل قائم کیا ——— اور آئن سٹائن
نے ایک عرصے بعد نظریۂ اضافیت دریافت کیا ——— جب یہ معلوم ہوا تو زمین سے
نکلنے کی تدبیریں سوچی جانے لگیں ——— لیکن یہ سب کچھ بہت بعد کی باتیں ہیں ———
صدیوں پہلے اولیاء و انبیاء نے ایک نئے جہان کی خبر دی تھی ——— یہ بھی بتایا کہ کششِ
ثقل حصارِ ملک و وطن تک باقی رہتی ہے ——— جب انسان اس حصار سے نکلتا ہے
تو خود بخود اوپر اٹھنے لگتا ہے ——— پھر عالمِ ناسوت سے چل کر عالمِ ملکوت میں عالمِ ملکوت
سے چل کر عالمِ جبروت، عالمِ جبروت سے چل کر عالمِ ہاہوت میں قدم رکھتا ہے ———
اور نہیں معلوم کہ کہاں کہاں کی سیریں کرتا ہے ———

اندھیری راتوں میں ذرا دم بھر کے لئے اوپر تو دیکھو ——— آسمانِ نیلگوں پر
ستاروں کا ایک جہاں آباد ہے ——— ان گنت ستارے ——— بے شمار
——— لاتعداد ——— ان ستاروں کے سامنے چاند کی کیا حقیقت! ——— ذرہ
برابر بھی تو نہیں ——— پھر یہ کتنا نیچے ہے اور وہ کتنے اوپر ہیں کہ ان کی روشنی بھی سالوں
میں پہنچتی ہے ——— اللہ اکبر! ——— اس جہانِ مہر و ماہ کو کون پا سکتا ہے؟ ———
——— مگر نظر کی تنگ دامانی تو دیکھو، صدیوں بعد انسان نے جب چاند پر قدم رکھا تو
ایک کہرام مچ گیا ——— کیا ہوا؟ ——— ایک نظرِ فریب، بے کیف زمین پر قدم رکھا
——— سبحان اللہ! یہی تو وہ زمین ہے جس کو ایک انسانِ کامل نے اشارے سے
پارہ پارہ کر دیا تھا ——— یہی تو وہ زمین ہے جس کو وہ روندتا ہوا عرشِ بریں تک پہنچا
تھا بلکہ اس سے بہت آگے ——— یہی تو وہ زمین ہے جس کا ذرہ ذرہ اس کی عظمت کے

گیت گا رہا ہے ——— !

اے اسیرو ! ——— ہاں اے حصارِ رنگ و نسل کے اسیرو ! ——— اے حصارِ ملک و وطن کے اسیرو ! ——— دیکھو دیکھو اسلام تم کو بلا رہا ہے ——— وہ آفاق کی خبریں لا رہا ہے ——— وہ ماورائے عالم میں قدم رکھ رہا ہے ——— چلو چلو ——— ہاں زمین سے آسمان کی طرف چلو ! ———

جنّت کی حقیقت

غالب نے خوب کہا ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

بڑے پتے کی بات کہہ دی ——— رازِ محبت کھول کر رکھ دیا ——— سچ ہے عاشق کو محبوب و مطلوب کے سوا کچھ نہیں چاہیئے ؎

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

اس کے لئے محبوب کا وصال ہی جنت ہے ——— اُس کی کوئی اور جنت نہیں ؎

تیرا ملنا ترا نہیں ملنا
اور جنت ہے کیا جہنم کیا؟

یہ کیسی محبت ہے کہ دعوئ محبت اور نگاہیں غیر کی جانب ! کسی عاشق نے خوب کہا ہے ؎

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

بے شک محبوب ہی عاشق کی زیست ہے اور محبوب ہی عاشق کی جنت ——— وہ نہ ملے تو جنت بھی جنت نہیں ہے ——— ایک خیال ہے ——— ایک تصور ہے۔

جنت کی حقیقت یہی تو ہے نا کہ وہاں حور و غلماں ہوں گے ——— شاندار

محلات ہوں گے ——— شیر و شہد کی نہریں ہوں گی ——— خورد و نوش کے سامان ہونگے ——— یہ ہوگا ——— وہ ہوگا ——— ہاں اے واعظ! بتا تو سہی وہ جانِ جاں بھی وہاں ہوگا؟ ——— وہ قرارِ دلِ مضطر بھی وہاں ہوگا؟ ——— وہ رشکِ ہزار جنت بھی وہاں ہوگا؟ ——— وہ میری تاریک راتوں کا اجالا بھی وہاں ہوگا؟ ——— وہ میری آنکھوں کا تلا بھی وہاں ہوگا ——— وہ جہانِ آرزو کا بادشاہ بھی وہاں ہوگا؟ ——— اگر نہیں ہوگا تو پھر مجھے کہنے دے ؎

دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

بے شک خاصانِ خدا جنت پر نظر نہیں رکھتے ——— اُن کی نظر تو اُسی پر لگی رہتی ہے ——— ایک آن نہیں ہٹتی ——— اُن کی زیست بھی وہی ہے ——— اُن کی جنت بھی وہی ہے ———

یہ کیسا ظلم کیا کہ بعض شارحین نے غالبؔ کے اس شعر کو ظریفانہ کہہ کر ٹال دیا ——— جس غزل کا مزاج عارفانہ و عاشقانہ ہو اس کا مقطع ظریفانہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ——— یہ محبت کی توہین ہے ——— یہ عشق کی تذلیل ہے ——— اس غزل کے ذرا یہ اشعار تو ملاحظہ کریں ؎

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے
بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے

کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

ہاں اب بتائیے ——— ایسی غزل کا مقطع ظریفانہ ہو سکتا ہے؟ ——— ہرگز نہیں ——— مقطع کو عاشقانہ اور عارفانہ ہی ہونا چاہیئے ———

عورت اور مرد

عورتوں کے لئے ملازمت اور فوجی تربیت اچھی بات ہے ——— مگر جب اس خدمت کے لئے مرد نہ رہے ہوں کہ یہ فیشن نہیں، ضرورت ہے ——— ہزاروں مرد ملازمتوں کو ترستے پھریں اور ہزاروں جوان فداکاری کے لئے تیار ہوں تو پھر عورتوں کو یہ فرائض سونپنا ضرورت نہیں، فیشن ہے۔

جب عورت ملازمت میں آئی یا میدانِ جنگ میں، اس وقت مردوں کا سخت کال تھا ——— لیکن رفتہ رفتہ ضرورت فیشن بن گئی اور مردوں کی دل آویزی کیلئے عورتوں کو رکھا جانے لگا ——— اور اس عدمِ مساوات اور غیر ضروری تعداد کی طرف کسی کی نظر نہ گئی کہ آخر مردوں کے دل لبھانے کے لئے عورتوں کا استعمال کیوں کیا جائے؟ ——— اللہ اللہ مساوات کا نعرہ لگانے والے خود عدمِ مساوات کا شکار ہو رہے ہیں!

تاریخِ اسلام پڑھ جائیے ——— کہیں عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش ملازمت کرتے نہ دیکھیں گے ——— بیشک جنگوں میں انہوں نے کام کیا ہے ——— فوجیوں کے حوصلے بڑھائے ہیں ——— زخمیوں کی مرہم پٹی کی ہے ——— اور یہ کام انہیں کو زیب دیتا ہے ———

عورت و مرد میں پیدائشی مساوات نہیں ——— ورنہ کیا ضرورت ہے کہ عورت کو عورت کہا جائے، کیوں نہ مرد کہا جائے؟ ——— یہ بھی عدمِ مساوات کا مظہر ہے ——— لیکن نہیں یہ عدمِ مساوات نہیں، خلقی ضرورت ہے ——— یہ علم نہیں کہ خدا ظالم نہیں ——— وہ جس طرح چاہتا ہے، بناتا ہے ——— پیدائش میں اس اختلاف نے

فطری طور پر ذمہ داریوں کو مختلف بنا دیا ہے ——— تعلیم، تربیت، ازدواجی زندگی ——— سب کے انداز مختلف ——— اس اختلاف سے انکار ایک کھلی حقیقت سے انکار ہے ——— اسی اختلاف کی وجہ سے اسلام نے مردوں سے زیادہ عورتوں کو رعایتیں دیں ——— افسوس دشمنوں نے اس کا الٹ کر دکھلایا، ذرا ان رعایتوں کی ایک جھلک تو ملاحظہ کریں :۔

مرد : مرد کو تلاشِ معاش اور اکلِ حلال کا مکلف بنایا۔

عورت : عورت کو اس عظیم ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا (یہ وہ رعایت ہے جو اس ترقی یافتہ معاشرہ میں عورت کو حاصل نہیں)

مرد : مرد کو اولاد کی پرورش کا ذمہ دار بنایا۔

عورت : عورت کو اس سے بھی بے نیاز کر دیا (مگر یہ عورت کی ممتا ہے کہ وہ بچے کی خود پرورش کرتی ہے)

مرد : مرد کو گھر کا ذمہ دار بنایا گیا۔

عورت : عورت کو اس ذمہ داری سے بری کر دیا گیا۔

مرد : جہیز اور بری میں ملنے والے تمام زیورات اور ساز و سامان سے مرد کو بے تعلق کر دیا گیا۔

عورت : عورت کو یہ ڈھیر کے ڈھیر زیورات اور ساز و سامان دے دیئے گئے۔

مرد : مرد کو جنگی خدمات کا مکلف بنایا گیا۔

عورت : عورت کو اس سے آزاد کر دیا گیا (یہ وہ رعایت ہے جو اس ترقی یافتہ دور میں بھی عورت کو حاصل نہیں)

مرد : مرد پر کسی حالت میں نماز معاف نہیں۔

عورت : عورت پر بعض حالات میں نماز تک معاف ہے (یہ نہایت اہم رعایت ہے)

مرد : مرد عورت کی بغیر اجازت باہر جا سکتا ہے مگر کسی حالت میں اس کی ازدواجی اور معاشی

ذمہ داریوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

عورت: عورت مرد کی اجازت کے بغیر باہر نہیں نکل سکتی (اجازت طلبی اگر ظلم ہے تو پھر ہر افسر اعلیٰ ماتحت افسر پر ظلم کرتا ہے)

مرد: مرد طلاق دے سکتا ہے مگر اس کی کھلی چھٹی نہیں بلکہ طلاق کو حلال چیزوں میں سب سے بری کہہ کر اس سے روکا گیا ہے۔

عورت: عورت بعض خصوصی حالات میں قاضی یا جج کی وساطت سے طلاق لے سکتی ہے، ہر گز بے بس نہیں (عورت کو طلاق کا مطلق اختیار اس لئے نہ دیا گیا کہ مرد کی نسبت وہ زیادہ جذباتی ہے اور اختیار کے لئے تحمل و بردباری کا ہونا اولین شرط ہے چنانچہ جس معاشرے میں طلاق کا اختیار دیا ہے، وہاں طلاق کے بے حساب مقدمات نظر آتے ہیں)

مرد: مرد کو عورت کے لئے پکا پکایا کھانا مہیا کرنے کا مکلف بنایا گیا (مگر یہ عورتوں کا کرم ہے کہ وہ مردوں کے لئے کھانا وغیرہ پکاتی ہیں اور شاید ان کو اس رعایت کا علم تک نہیں)

عورت: عورت کھانا پکانے اور گھر کے کام کاج کی مکلف نہیں۔

مرد: مرد پر واجب ہے کہ وہ عورت کے والدین کو اپنے ہی والدین سمجھے۔

عورت: اسی طرح عورت پر واجب ہے کہ وہ مرد کے والدین کو اپنے ہی والدین سمجھے (حسن معاشرت کا یہ عجیب و غریب نکتہ ہے)

مرد: مرد کی تنخواہ سے عورت اپنا حق طلب کر سکتی ہے۔

عورت: عورت کی تنخواہ سے مرد کسی چیز کا حق دار نہیں۔

مرد: جدائی کی صورت میں عدت کا سارا خرچ اور بچوں کی پرورش کا خرچ مرد کے ذمہ ہے۔

عورت: عورت ان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہے۔

مرد : مرد ایک سے زیادہ عورتیں کر سکتا ہے۔ (شریعت میں چار عورتوں کی جو اجازت دی ہے تو اس کی وجہ ایک تو مرد کے فطری قویٰ ہیں اور دوسری وجہ معاشرے میں کفالت کی ذمہ داری قبول کرنا ہے اسی لئے مرد کو تمام عورتوں میں معاشرتی مساوات کا ذمہ دار قرار دیا، بصورتِ دیگر اس کو ہرگز ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت نہیں، ایسے معاشرے میں عورتوں کے لئے ملازمت کی نوبت آ ہی نہیں سکتی)

عورت: عورت بیک وقت ایک سے زیادہ مرد نہیں کر سکتی (اس کی ایک وجہ اس کی فطری کمزوری ہے اور دوسری وجہ حسب و نسب اور خاندان کا بقا ہے عورت کو کئی مردوں کی اجازت مل جائے تو معاشرہ تقسیم ہو کر رہ جائے اور خاندان و حسب و نسب کا تصور خاک میں مل جائے۔ اس کے علاوہ عورت مردوں کے ہاتھ میں ایک عاجز کھلونا بن جائے جیسا کہ مغربی ممالک میں ہے۔ شریعتِ اسلامیہ نے عورت کو محفوظ رکھا اور جدید تہذیب نے غیر محفوظ بنا دیا، عورت کے لئے یہ سب سے بڑا عذاب ہے)

مرد : مرد پر پردے کی قید نہیں (کیونکہ اس کے مدِ مقابل کوئی ایسی شخصیت نہیں جو اس سے زیادہ جذباتی ہو، اس کے علاوہ اس کو لامحدود معاشرتی ذمہ داریاں بھی پوری کرنی ہیں)

عورت : عورت پر پردے کی قید ہے (کیونکہ اس کے مقابل ایک ایسی ہستی ہے جو اس سے زیادہ جذباتی ہے، اس کے علاوہ پردے میں حیا اور حُسن محفوظ رہتے ہیں جو عورت کا حقیقی زیور ہے، مزید برآں اس پر کوئی ایسی معاشرتی ذمہ داری بھی نہیں جس کا تعلق بے پردگی سے ہو، اگر حالات سے مجبور ہو کر جانا ہی پڑ جائے تو اس کے لئے یقیناً اجازت ہے)

رعایات و فرائض کی یہ فہرست آپ نے دیکھی! ——— یہ بھی دیکھا کہ اس

فہرست میں عورت کا حسن و جمال، طاقت و قوت، عفت و عصمت کی پوری ضمانت دی گئی ہے ——— اور مرد کو ضامن بنایا گیا ہے ——— سچ پوچھئے تو اس فہرست میں مرد مجبور نظر آتا ہے اور عورت مختار و محبوب معلوم ہوتی ہے ——— لیکن پھر بھی یہ کہا جائے کہ عورت کے ساتھ زیادتیاں کی گئی ہیں ——— معاذ اللہ، استغفر اللہ! ——— تو تھوڑی دیر کے لئے اگر یہ "زیادتیاں" مردوں کو منتقل کر دی جائیں تو پھر بتاؤ کہ کسی عورت کا کیا حال ہوگا! ——— غور کرو ——— ہاں خوب غور کرو! ——— بیشک ایسا کیا جاتا تو یہ ظلم ہوتا اور اب بھی ایسا کیا گیا تو ظلم ہوگا ——— اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا ——— وہ رحیم ہے، رحم ہی کرتا ہے ——— بندے بندوں پر ظلم کرتے ہیں اور ظلم کر سکتے ہیں ——— مگر وہ تو رحمٰن ہے، اس کے ہاں کرم کے سوا کچھ نہیں۔

اے آدمِ خاکی کی دلاری! ——— اے محمد مصطفےٰ کی پیاری! ——— اے نوعِ انسان کی کیاری! ——— بتا تو سہی، رب العالمین اور رحمۃ للعالمین نے تجھے کیا کیا دیا؟ ——— اور اس دنیا نے تجھ سے کیا کیا لیا؟ ——— اُس نے تجھ کو چین دیا ——— اِس نے بے چین بنایا ——— اُس نے تجھے محبوب بنایا، اِس نے مظلوم بنایا ——— اُس نے تجھے مختار بنایا، اِس نے تجھے مجبور کیا ——— اُس نے طاقت و قوت بخشی، اِس نے کمزور و ضعیف کیا ——— اُس نے عصمت و عفت کو محفوظ رکھا، اِس نے برباد کیا ——— اُس نے حسن و جمال کی پاسداری کی، اِس نے خاک میں ملایا ——— اُس نے بڑھاپے میں بھی مسندِ عزت پر بٹھایا، اِس نے بڑھاپے میں بے آسرا کیا ———

اگر یہ سب کچھ صحیح ہے ——— اور یقیناً صحیح ہے تو بتاؤ تو سہی کہ مہربان کون ہے اور ظالم کون؟

نظامِ مصطفےٰ! حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا انقلاب عجیب انقلاب تھا ——— شاید چشمِ عالم نے ایسا انقلاب نہ دیکھا ہو ——— ایک طبقہ کو ہٹا کر دوسرے

طبقہ کو یا ایک قوم کو ہٹا کر دوسری قوم کو نہ لایا گیا ــــــ جو سامنے تھے انہیں کو ٹھیک کیا گیا ــــــ ان میں زانی بھی تھے ــــــ شرابی بھی تھے ــــــ خائن بھی تھے ــــــ بدکار بھی تھے ــــــ قاتل بھی تھے ــــــ سفاک بھی تھے ــــــ لیکن رفتہ رفتہ سب کو ایسا بدلا کہ دنیا دیکھ دیکھ کر حیران ہوئی جاتی ہے ــــــ تو ایسا انقلاب لانے کے لئے سب سے پہلے خود کو بدلنا ہوگا ــــــ دردمندی و دل سوزی کے ساتھ ان کے پاس جانا ہوگا جن سے ہم کو نفرت ہے ــــــ کیا گیارہویں صدی ہجری میں شیخ احمد سرہندی مجدد الفِ ثانی علیہ الرحمہ اسی اسوۂ محمدی پر عمل کر کے اسلامی انقلاب نہیں لائے؟ ــــــ تاریخ پر جن کی گہری نظر ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ آپ کی دردمندانہ تبلیغ نے جہانگیر پر کیا اثر کیا ــــــ ایک سے ایک بہتر بادشاہ سامنے آتا گیا ــــــ شاہ جہان ــــــ اور پھر اورنگ زیب علیہ الرحمہ جنہوں نے پاک و ہند میں نظامِ مصطفٰی نافذ کیا۔

نظامِ مصطفٰی کوئی ایسی چیز نہیں جو صرف کاغذ پر نافذ کی جائے ــــــ وہ تو دلوں پر نافذ ہوتا ہے ــــــ کاغذ پر بارہا نافذ ہو چکا ــــــ صورتوں کے بدلنے سے نظام نہیں بدلتے ــــــ سیرتوں کے بدلنے سے نظام بدلتے ہیں اور انقلاب آتے ہیں ــــــ اس لئے جیتی جاگتی مثالیں پیش کرتا ہوں گی۔

نظامِ مصطفٰی سر پھروں کا انقلاب نہیں کہ بیٹھے بٹھائے لوگوں کو اکسا کے اور جو موجود ہے اس کو معدوم کر دے ــــــ یہ اصلاحِ حال کا داعی ہے ــــــ قلبِ ماہیئت کا نام ہے ــــــ بے خواہ مخواہ جھگڑا مول نہیں لیتا ــــــ یہ فتنہ کا نام نہیں ــــــ امن کا پیامبر ہے اور امن ہی سے حاصل ہوتا ہے ــــــ یہ انسانوں کو مارنا نہیں سکھاتا ــــــ انسان سے پیار کرنا سکھاتا ہے ــــــ یہ انسان کو انسانوں کے ہاتھوں ذلیل و رسوا نہیں کرتا ــــــ اُس کی تعظیم و تکریم کرتا ہے ــــــ یہ انسان کی دولت نہیں سمیٹتا ــــــ یہ بھوکا پیاسا نہیں ــــــ یہ اُسکو

اتنا دیتا ہے کہ وہ سنبھال نہیں سکتا ——— یہ غنی ہے، فقیر نہیں ——— یہ سخی ہے، محتاج نہیں ——— یہ آقا ہے، غلام نہیں ——— یہ بادشاہ ہے، رعایا نہیں ——— یہ غالب ہے، مغلوب نہیں ——— یہ حاکم ہے محکوم نہیں ——— یہ محبوب ہے، مردود نہیں ——— اس کی بنیاد خوفِ خدا پر ہے ——— اور جہاں خوفِ خدا ہو وہاں احترامِ انسانیت بھی ہے اور انسان خدا کی پیاری مخلوق ہے ——— یہ سایۂ رحمت ہے ——— انسان کا دل رکھتے ہوئے آگے بڑھتا ہے ——— یہ کسی کا دل نہیں دکھاتا کہ ایک دِل والے کا نظام ہے ——— یہ بچوں پر شفقت سکھاتا ہے اور بزرگوں کا احترام سکھاتا ہے ——— لین دین کا سلیقہ سکھاتا ہے ——— ناپ تول کا ڈھنگ بتاتا ہے ——— کھانے پینے، بولنے چالنے، چلنے پھرنے کے آداب سکھاتا ہے ——— یہ حیوان کو انسان بناتا ہے ——— انسان کو حیوان نہیں بناتا ——— اس کی تعزیر بھی عبرت ہے اور اس کا قصاص بھی زندگی ہے ——— یہ گرتوں کو اٹھاتا ہے ——— مُردوں کو جِلاتا ہے ——— یہ آفتِ جاں نہیں، راحتِ جاں ہے ———

دنیائے جدید کا ہر تعمیری انقلاب نظامِ مصطفےٰ کا مرہونِ منت ہے ——— یہ ایک عظیم حقیقت ہے ——— کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے ——— ملکِ چین کو دیکھئے کہ نظامِ مصطفےٰ کے صرف ایک گُر پر عمل کر کے اقتصادی طور پر کہاں سے کہاں پہنچ گیا! ——— روزِ اول ہی سے اس نے عہد کیا کہ ہم کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں گے، جو کچھ بن پڑے گا خود کریں گے ——— محنت و خودداری کا یہ سبق کس نے سکھایا؟ ——— اسی محمدِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے اولاد سے یہ کہا کہ والدین سے مانگنا بھی ذلت ہے ——— اللہ اکبر! ———

اور جب چو این لائی مرا تو اس کے فداکاروں نے پست ہمت عورتوں کی طرح

نہ اپنے چہرے نوچے اور نہ بال کھسوٹے، نہ اپنے سینے پیٹے بلکہ وہ کر دکھایا جو مَردوں کے شایانِ شان تھا ـــــــ اس غم سے وہ ایک نیا حوصلہ لے کر ابھرے ـــــــ اور یہ بات کس سے سیکھی؟ ـــــــ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھی ـــــــ اہلِ بیتِ اطہار سے سیکھی ـــــــ صحابہ کرام سے سیکھی ـــــــ یہ وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جنہوں نے ہر غم والم کو اپنے حوصلوں سے شکست دی لیکن افسوس صد افسوس ہم نے سینہ زنی اپنا شعار بنایا ـــــــ اور غیروں نے ان بلند ہمتوں سے سینہ سپری کا درس لیا ـــــــ

نظامِ مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) نافذ کرنا ہے تو عالم و عامی کو اسوۂ محمدی پر چلنا ہوگا ـــــــ اللہ اللہ! عالم، عالم سے ناراض ـــــــ جاہل، جاہل سے خفا ـــــــ پہلے دل ملانے ہوں گے ـــــــ خلوص وللّٰہیت کی بات پیدا کرنا ہوگی ـــــــ خود نکلنا ہوگا ـــــــ خود بلانا ہوگا ـــــــ دعوتوں کا انتظار ترک کرنا ہوگا ـــــــ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیا نہیں، دیا ہی دیا ہے ـــــــ جانشینِ مصطفےٰ کو لینا نہیں، دینا ہوگا ـــــــ صلوں سے دل ہٹانا ہوگا ـــــــ مرغن کھانوں سے ہاتھ اٹھانا ہوگا ـــــــ دولت و ثروت پر لات مارنی ہوگی ـــــــ ہاں اللہ اور رسول کے لئے اپنی پونجی لگانی ہوگی ـــــــ سب کچھ نثار کرنا ہوگا ـــــــ اپنی ہستی مٹانی ہوگی ـــــــ اپنی چال ڈھال اور رنگ ڈھنگ بدلنے ہوں گے ـــــــ تقریروں کی ساحری سے جیبیں ڈھیلی کرنے کا ہنر چھوڑنا ہوگا ـــــــ نصیحت وہدایت پر اجرت اور وہ بھی طلب و سوال کے ساتھ! ـــــــ حیرت ہے! ـــــــ لیکن اللہ کے رسولوں نے تو یہ نہیں کیا ـــــــ تو پھر جانشینِ رسول یہ کیا کر رہے ہیں؟ ـــــــ سورۃ الشعراء پڑھو اور دیکھو حضرتِ نوح علیہ السلام کیا کہہ رہے ہیں؟ ـــــــ حضرت ہود علیہ السلام کیا کہہ رہے ہیں؟ ـــــــ حضرتِ صالح علیہ السلام کیا کہہ رہے ہیں؟ ـــــــ حضرتِ لوط علیہ السلام کیا کہہ رہے ہیں ـــــــ حضرتِ شعیب علیہ السلام کیا کہہ رہے ہیں؟ ـــــــ اللہ اللہ!

سب بیک زبان کہہ رہے ہیں ——— وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ (سورۃ الشعراء، آیات ۱۰۹، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۶۴، ۱۸۰، ۱۹۰)

"میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر اسی پر ہے جو دونوں عالم کا رب ہے"

——— ہاں ان رسولانِ برحق کے راستہ پر چلنا ہوگا ——— ہم کو طلب و سوال نے مارا ——— ہم کو قرضوں نے مارا ——— ہم کو اسراف و تبذیر نے مارا ——— ہم کو ہماری بدکاریوں نے مارا ——— طلب و سوال سے زبان بند رکھنی ہوگی ——— قرضوں سے توبہ کرنا ہوگی ——— اسراف و تبذیر سے ہاتھ اٹھانا ہوگا ——— نیکوکاری کا عزم کرنا ہوگا ——— موٹا جھوٹا پہننا ہوگا ——— ہلکا پھلکا کھانا ہوگا ——— جھونپڑیوں سے دل لگانا ہوگا ——— محلوں سے دل اٹھانا ہوگا ——— تب کہیں جا کر نظامِ مصطفےٰ نافذ ہو سکتا ہے ——— خدارا کوئی تو نمونہ دکھائے اور فقیری میں ہیبتِ شاہی پیدا کرے! ———

اگر ایسا نہ ہوگا تو پھر دیکھنے والے 'ہو چی منہ' کو دیکھیں گے ——— 'چواین لائی' کو تکیں گے ——— 'ماؤزے تنگ' سے لو لگائیں گے ——— اور 'لینن' کی باتیں کریں گے ——— آؤ آؤ! محمدِ مصطفےٰ کی باتیں کرو ——— اپنی دنیا بدلو ——— اور ایک حسین و کریم انقلاب کی کوشش کرو ؎

تقدیرِ امم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا — مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

عاشقِ رسول ؐ

آنانکہ غمِ تو برگزیدند ہمہ
در کوئے شہادت آرمیدند ہمہ
در معرکۂ دو کون فتح از عشق است
باآں کہ سپاہ اور شہیدند ہمہ

عشق و محبت کی قربان گاہ میں وہ تختۂ دار پر چڑھایا گیا ——— سب سے کہ

مرگیا ——— مگر شہیدِ عشق مرا نہیں کرتے ——— وہ مر کر جیا کرتے ہیں ؎

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ سر تن سے جدا ہو چکا ہے ——— جسم بے جان پڑا ہے ——— مگر جان آفریں کہہ رہا ہے ——— خبردار اِس کو مردہ نہ کہنا ——— یہ زندہ ہے ——— اِس نے ہماری چاہت میں جان دی ہے ——— تم کو کیا خبر؟ ——— تم کیا سمجھو؟ ———

شعرائے اردو کے تذکرے چھوٹے موٹے شاعروں سے بھرے پڑے ہیں ——— مگر جس کا ذکر کیا جانا چاہیے تھا، نہ کیا گیا ——— شاعروں نے اس لئے چھوڑا کہ وہ عاشقِ صادق تھا ——— وہ کسی کا شاگرد نہ تھا ——— شاگرد تو غالب بھی کسی کا نہ تھا مگر وہ عاشقِ صادق نہ تھا ——— وہ محبت سے کھیلتا تھا، اس لئے سب نے اس کو یاد رکھا ——— ظاہر پرستوں کو شراب و کباب اور جھوٹی محبت میں بہت مزہ آتا ہے ——— سچی محبت میں ان کے لئے کوئی کشش نہیں ——— اور علماء نے اس لئے چھوڑا کہ وہ سچی محبت کی بات کرتا تھا ——— وہ اپنے محبوب کا فداکار اور جاں نثار تھا ——— سیاست دانوں نے اس لئے چھوڑا کہ وہ جذبات کی رَو میں نہیں بہتا تھا ——— وہی کہتا تھا جو اس کا مولیٰ کہتا تھا ——— اور اپنوں نے اس لئے کہ وہ صف سے باہر نکل نکل کر حملے کیا کرتا تھا ——— وہ صف در و صف شکن تھا ——— وہ غلامِ حیدرِ کرّار تھا ——— غرض سب نے چھوڑا ——— مگر اس کے رب نے اس کو نہ چھوڑا ——— اس کے محبوب نے اس کو نہ چھوڑا ——— ہاتھ پکڑا اور ایسا اٹھایا کہ پاک و ہند کے گلی کوچے اس کے نعروں سے گونج اٹھے ——— سنو سنو ——— ذرا یہ آواز تو سنو! ؎

مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

غافلوں نے آواز سنی مگر دھیان نہ دیا ——— آدمیوں سے کہا "دیکھو دیکھو، ذرا اِس کو دیکھو!" ——— شاعروں سے کہا "سنو سنو، ذرا اِس کو سنو!" ——— کسی نے سنا اور نہ دیکھا ——— جس کا سکہ چلتا ہے، وہی چمکتا ہے ——— بانیِ عالم کا یہی دستور ہے ——— مگر دستورِ عشق نرالا ہے ——— کھرے سکّوں کی چمک اپنی طرف متوجہ کر کے ہی رہتی ہے ——— کتنے ہی پرانے ہو جائیں ——— پرانے نہیں ہوتے ——— ان کا حسن سدا بہار ہے ——— ہزار سال گزر جانے کے بعد بھی نکالے جاتے ہیں ——— اور عالی شان محلوں میں سجائے جاتے ہیں ——— اور پھر ایک عالم ان کی دید کے لئے امنڈ پڑتا ہے ——— تو جب وہ چمکا جس کو دبا دیا گیا تھا ——— سب دیکھنے لگے ——— سب بولنے لگے ——— للہ الحمد کہ آج وہ مسندِ عزت پر بٹھا دیا گیا ہے ———

فرزانوں کی بستی میں وہ ایک دیوانہ تھا جس نے محبت کے چراغ روشن کیے ——— جس نے سونی محفلوں کو باغ و بہار بنایا ——— جس نے کشتِ ویراں کو لالہ زار کیا ——— جس نے آندھیوں میں دیئے جلائے ——— جس نے طوفانوں میں کشتیاں چلائیں ——— وہ یداللہ تھا ——— اس کے ہاتھ کی بے پناہ قوت بتا رہی ہے کہ وہ اس کا ہاتھ نہیں تھا، وہ خدا کا ہاتھ تھا ——— "میرا بندہ جب مجھ سے قریب ہوتا ہے تو میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے" ——— بیشک وہ خدا کا ہاتھ تھا ——— ایک انسان کے ہاتھ میں اتنی قدرت کہاں کہ جدھر بڑھے، سیلِ رواں کی طرح اور جدھر اُٹھے، ابرِ باراں کی طرح ———!

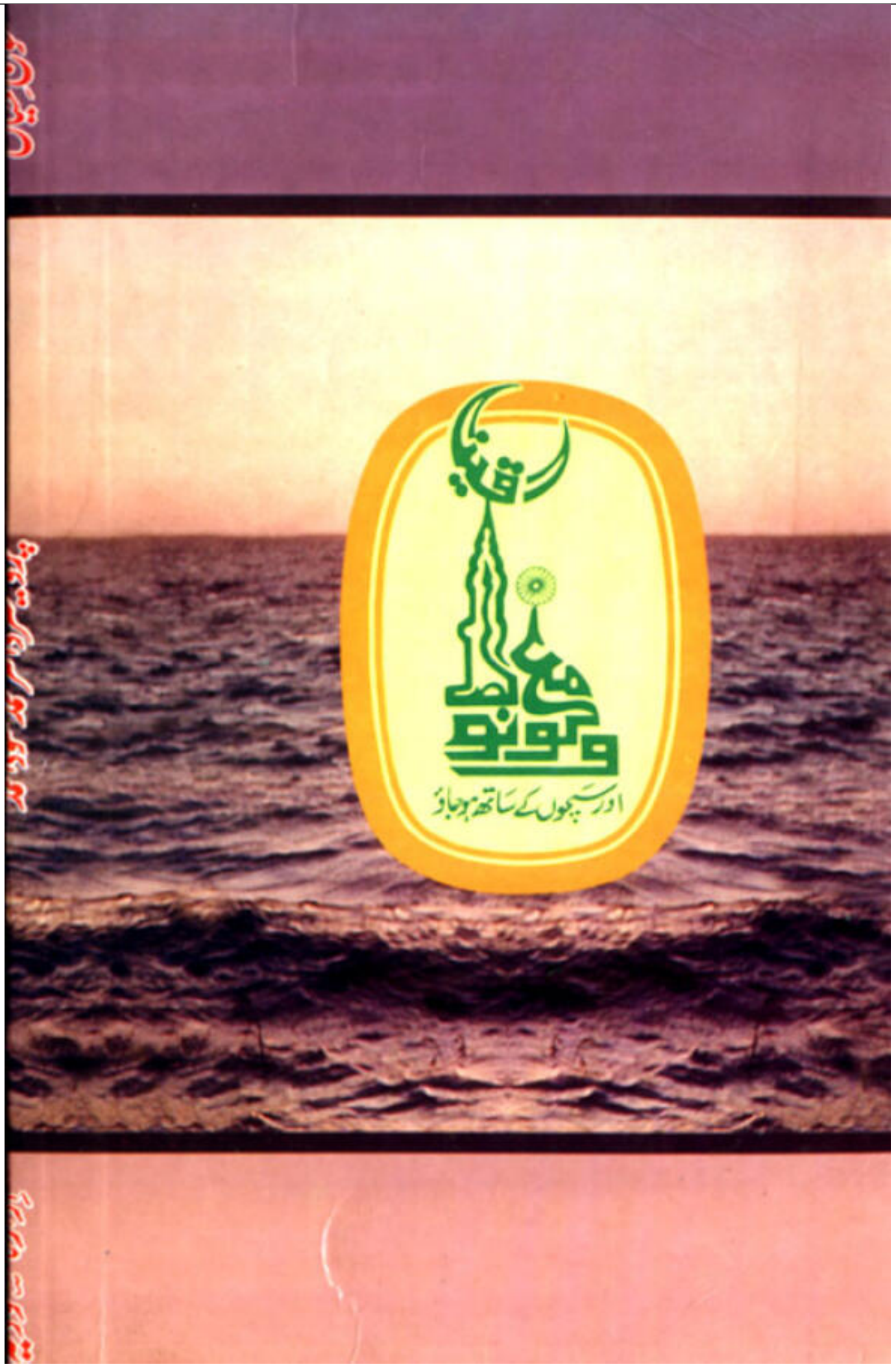

وکونوا مع الصادقین
اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ